مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ۔ علمی اسفار کی روشنی میں

Mawlānā Sa'eed Aḥmed Akbar A'ābādī:
In the Course of Scholarly Travels

Dr. Humera Naz

Assistant Professor

Department of Islamic History, University of Karachi

ABSTRACT

As wise say travel is half of knowledge, therefore, this saying fits completely on the travelogue of Mawlānā Sa'eed Aḥmed Akbar Aabādī. Mawlānā Sa'eed Aḥmed Akbar A'ābādī (1908-1985) was one of the broad-minded 'ulamas of the 20th century in the Indian sub-continent. He received both conventional as well as modern education and later taught there too. The course of intellectual erudition and personality impacts of Mawlānā Akbar A'ābādī was not only restricted to sub-continent but rather he travelled many countries across the globe as an expert scholar in Islāmic knowledge. Since the nature of these travels to various countries in different times was scholarly, they are described in his letters and travelogue. His travels to different countries and participation in scholarly meetings made him more splendors in his insights and provided knowledge and experience which is noticeable in his personality. This can be reviewed in the article under review. Mawlānā's travelogues are the essence of his profound observations and studies. He observed every culture and their history very deeply, wherever he travelled, which provided him the opportunity to learn from the analysis of each event through observation. The nature of his travelogues is very simple and free of any artificiality; it offers an oasis of knowledge which can be well evaluated from his travelogues.

Keywords: Travelogue, Knowledge, Scholar, Mawlānā Sa'eed Aḥmed Akbar A'ābādī, Islām.

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ سرزمین پاک و ہند ایک ایسا مردم نیر خطہ ہے جہاں ان گنت سربر آوردہ اور نابغہ روزگار ہستیوں نے اپنے کردار اور کارناموں اور سیاسی و نظریاتی تحریکوں نے اس خطہ کی سیاسی و تہذیبی تاریخ پر انمٹ نقوش مرتب کیے اور ان کے عظیم

الشان کارنامے نقش دوام بن کر سینہ عالم پر ثبت ہوئے اور وہ خود حیات جاوید سے ہمکنار ہوئے۔ انہی عظیم المرتبت ہستیوں میں ایک تاریخ ساز ہستی مولانا سعید احمد اکبر آبادی (۱۹۰۸ء-۱۹۸۵ء) کی ہے جن کی روشن کردہ شمعوں سے آج برصغیر پاک و ہند جگمگ کر رہا ہے۔

آپ بیسویں صدی کے ان مایہ ناز فرزندانِ اسلام میں سے ہیں جن کے رشحاتِ قلم نے ملک و ملت کی معنوی عظمت و رفعت میں چار چاند لگا دیئے۔ آپ علم و حکمت کا ایک ایسا آفتاب تھے جو گذشتہ نصف صدی تک برصغیر پاک و ہند کو منور کرتا رہا وہ زندگی بھر علم کی ترویج و فروغ کے لیے سینہ سپر اور اسلام کی تبلیغ میں مصروف رہے۔ آپ کا شمار برصغیر کے انتہائی روشن خیال اور وسیع النظر علماء میں ہوتا ہے۔ وہ ایک بلند پایہ مصنف اور صاحب طرز ادیب و انشاء پرداز تھے۔ مولانا اکبر آبادی کی دینی و علمی تربیت، تدریسی و تحقیقی خدمات کا ۷۷ سالہ سفر دیوبند سے علی گڑھ، سینٹ اسٹیفن کالج اور یورپ و مغرب کی جامعات تک محیط ہے۔ اس طویل تعلیمی و تدریسی اور تحقیقی سفر میں مولانا اکبر آبادی نے ایک درجن کے لگ بھگ مستقل تصانیف¹ ضخیم مقالہ جات اور ہزار ہا صفحات پر مشتمل سیکلزوں، مضامین ر قم کیے ہیں۔

مولانا نے علمی و تحقیقی سرگرمیوں کی سرپرستی و فروغ کے لیے ”مدوۃ المصنفین“² قائم کیا۔ اس ادارہ کے تحت ایک ماہانہ جریدہ ”برہان“ کا اجراء کیا۔ انہوں نے برہان کے مدیر کی حیثیت سے ”نظرات“ کے عنوان سے قومی و ملی، عصری اور بین الاقوامی امور و مسائل پر اداریوں کے علاوہ سیکلزوں مقالات و مضامین اور وفيات پر شذرے تحریر کیے۔ مولانا اکبر آبادی کے مختلف النوع موضوعات پر علمی و تحقیقی کام کی ضخامت کو دیکھ کر اندازہ نہیں کیا جاسکتا ہے کہ یہ تنہا فرد واحد کا کام ہے۔

مولانا کے فیضانِ علمی اور اثراتِ شخصی کا سلسلہ ہندوستان تک محدود نہیں تھا، بلکہ ان کی عظیم شخصیت کی کرنیں، قومی، سیاسی اور ملکی حدود کو توڑ کر مہذب دنیا کی سبھی علمی اور مذہبی حلقوں تک پھیل گئی تھیں۔ وہ ہندوستان کے علاوہ پاکستان، انگلینڈ، روس، امریکہ، کینیڈا، جاپان، جنوبی افریقہ، ملائیشیا، انڈونیشیا، ایران، مصر اور سعودی عرب کے علمی اور تحقیقی حلقوں میں بھی ایک جانی پہچانی شخصیت سمجھے جاتے تھے اور ان کا نام عزت و احترام کے ساتھ لیا جاتا تھا۔ وہ ایک برگزیدہ اور دینی علوم کے ماہر و دانشور کی حیثیت سے دنیا کے اکثر ممالک کا دورہ کر چکے تھے اور ان ملکوں کے دینی، مذہبی، علمی اور تحقیقی حلقوں میں اپنی ذکاوت، ذہانت، تجربہ علمی اور تحقیقی صلاحیت کی دھاک بٹھا چکے تھے۔ یورپ اور امریکہ کی متعدد یونیورسٹیوں نے ان کے علمی اور دینی کمالات کے اعتراف میں وزیٹنگ پروفیسر کے اعزاز سے نوازا اور انہوں نے دنیا کی مشہور یونیورسٹیوں کے علوم شرقیہ کے حلقوں کو اپنے خیالات اور علمی مویشگان فیوں سے متاثر کیا۔ وہ دنیا کے مختلف ملکوں میں ہونے والے بیشتر علمی مباحثوں، سیمیناروں اور علمی و دینی کانفرنسوں میں شریک ہوئے اور مستقل رکن کی حیثیت سے متعدد عالمی انجمنوں اور اداروں میں شریک کئے گئے۔³

مولانا کے یہ علمی اسفار چونکہ معلومات کا بیش بہا خزانہ ہیں اس لیے ان سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا ان اسفار کی اہمیت کے پیش نظر ہم نے اسے شامل مطالعہ کیا ہے۔ جسے ہم مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ کی علمی و ادبی خدمات اور سرگرمیوں کا ایک دائرہ/موضوع کہہ سکتے ہیں جو انہوں نے مختلف اوقات اور زمانوں میں اندرون و بیرون ملک میں دینی و علمی کانفرنسوں میں شرکت کی غرض سے بحیثیت مہمان پروفیسر/تقرر کے طور پر کئے۔ مولانا نے بعد میں ان اسفار کی روداد کو قلم بند کر کے ”برہان“ میں بھی شائع کیا جسے ہم معروف معنوں میں ”سفر نامہ“ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ہم نے مولانا اکبر آبادی کے انہی سفر ناموں کو اپنے مقالے کا موضوع بنایا ہے۔ اور ان اسفار کی

روشنی میں جہاں آپ کی شخصیت کا جائزہ لیا ہے وہیں یہ سفر نامے مولانا کے گہرے مشاہدے و مطالعے کا بیش بہا خزانہ اور ان کے ادبی اسلوب کا نمونہ بھی ہیں۔ مولانا کے یہ سفر نامے روایتی سیاحوں کی روایتی داستان نہیں بلکہ جس طرح مولانا کے اسفار کی ایک مقصدیت ہے، یعنی ان اسفار کی تحریر و ترتیب میں بھی یہ مقصدیت کارفرما نظر آتی ہے۔ اگرچہ مولانا کے اسفار کی نوعیت و مقاصد خالص علمی و تعلیمی ہے، تاہم وہ جہاں بھی گئے انہوں نے وہاں کی تاریخ، تہذیب اور سماج کا بھی مطالعہ کیا اور اس مطالعے میں دوسروں کو بھی شریک کیا ہے۔ ذیل میں مولانا اکبر آبادی کے ان سفر ناموں کی فہرست پیش کی جا رہی ہے۔

- چند روزہ نئی تال میں⁴
- حیدرآباد میں چار دن⁵
- دیارِ غرب کے مشاہدات و تاثرات⁶
- قاہرہ میں اسلامی کانفرنس⁷
- انڈونیشیا کی افرویشیائی اسلامی کانفرنس⁸
- قاہرہ میں مجمع الجبوت الاسلامیہ کی دوسری سالانہ کانفرنس⁹
- قاہرہ میں مجمع الجبوت الاسلامیہ کی تیسری کانفرنس¹⁰
- بنگلور میں ایک اہم سیمینار اور اس نواح کا میرا پہلا سفر¹¹
- وسو بھارتی شانتی کمیٹن میں سیمینار¹²
- ایران میں چند روز¹³
- چند روز جاپان میں¹⁴
- مدارس میں نو دن¹⁵
- پاکستان میں بین الاقوامی کانفرنس اور میرے مشاہدات و تاثرات¹⁶
- سفر نامہ پاکستان¹⁷
- میسور میں دو دن¹⁸
- کلکتہ میں دس دن¹⁹
- پاکستان، جنوبی افریقہ اور پھر پاکستان²⁰

سفر ناموں کا اجمالی مطالعہ

ہم ذیل میں مولانا کے مذکورہ سفر ناموں کا احوال اور ان کی خصوصیت کا جائزہ لیں گے جو باآسانی دستیاب ہو سکے ہیں۔

۱۔ ان میں پہلا سفر نامہ ”چند روزہ نئی تال“ ہے۔ مولانا نے نئی تال کا سفر ۱۹۳۹ء میں کیا تھا۔ اس سفر کی غرض وغایت اگرچہ تبدیلی آب و ہوا اور کچھ راحت و آرام تھا لیکن اس راحت و آرام کے پیش نظر بھی آنے والے دنوں میں خود کو تعلیمی و تحقیقی کام کے لئے پہلے سے زیادہ مستعد اور تازہ دم کرنا تھا۔ اس سفر نامہ میں مولانا نے نئی تال کی مختصر مگر جامع تاریخ کے ساتھ وہاں کے قدرتی مناظر کی منظر کشی بھی نہایت دل نشین انداز میں کی ہے۔ انہوں نے اس سفر نامہ میں نئی تال کے مسلمانوں کا احوال بھی بیان کیا ہے اور وہاں کے گرجا گھروں، تعلیمی اداروں اور صنعتی اداروں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔²¹

۲۔ ”دیارِ غرب کے مشاہدات و تاثرات“۔ یہ مولانا کا دوسرا سفر نامہ ہے۔ یہ سفر نامہ مولانا کے سفر کینیڈا کے شہر مونٹریل کے بارے میں ہے جو انہوں نے ۱۹۶۲ء میں کنگل یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی جانب سے ملنے والی دعوت پر بحیثیت مہمان پروفیسر کے (visiting professor) کیا۔ مولانا کینیڈا میں تقریباً آٹھ ماہ تک قیام رہا۔ اس دوران انہوں نے مختلف عنوانات و موضوعات پر لیکچر دیئے۔ علمی و ادبی مجالس میں شرکت کی۔ انسٹی ٹیوٹ کی سوشل لائف اور اہم شخصیات سے ملاقات کا احوال

بیان کیا اور مقامی آبادی کی طرز معاشرت کا بھی تفصیلی مطالعہ دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ مولانا کے اس سفر نامے کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے مغرب کی خصوصیت کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے²²۔ تاہم مولانا کے مغربی معاشرے کی خصوصیت کے اظہار کا مقصد قطعاً یہ نہیں ہے کہ مولانا ان سے مرعوب دکھائی دیتے ہیں بلکہ انہوں نے مسلمانوں کو یہ پیغام دینے کی کوشش کی ہے کہ انہیں بھی مغربی معاشرے کے خصائص، علم و عمل اور محاسن اخلاق کو اپنا کر ترقی یافتہ قوم کی صف میں شامل ہونا چاہیے۔

۳۔ تیسرا سفر نامہ ”قاہرہ میں پہلی اسلامی کانگریس“ کے عنوان سے ہے۔ اس سفر نامہ کی روداد علمی مباحثوں اور مذاکروں کے موضوعات اور احوال پر مشتمل ہے۔ آپ کا یہ سفر مارچ ۱۹۶۴ء میں قاہرہ کی جامعہ ازہر کے ماتحت اسلامی تحقیقات کی اکادمی کی دعوت پر تھا جہاں پہلی عالمی موتمر منعقد ہوئی تھی۔ جو دو ہفتہ ۲۳ مارچ تک جاری رہی۔ اگرچہ آپ کا یہ سفر مجموعی طور پر علمی سرگرمیوں کی روداد پر مبنی ہے تاہم آپ نے وہاں کے بڑے بڑے شہر، تاریخی آثار و مقامات کا بھی دورہ کیا اور وہاں صدر جمال عبدالناصر کی قیادت میں علم و فن، سائنس و ٹیکنالوجی، صنعت و حرفت، فوجی تعلیم و تربیت، نظم و ضبط، اقتصادی خوش حالی، صحت و توانائی، ایجاد و اختراع میں مصریوں کی غیر معمولی ترقی و پیش قدمی کا بھی مشاہدہ کیا۔ اس مشاہدہ و مطالعہ سے مصر کی ترقی و خوشحالی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔²³

۴۔ مولانا اکبر آبادی کا چوتھا سفر نامہ بعنوان ”بنگلور میں ایک اہم سیمینار اور اس نواح کا میرا پہلا سفر“ ہے۔ اس سفر نامہ میں مولانا نے جنوبی ہند کے مشہور حسین و جمیل شہر بنگلور میں ایک سیمینار میں شرکت کی۔ یہ سیمینار ۸ تا ۱۲ ستمبر ۱۹۶۷ء میں منعقد ہوا۔ اس سیمینار کا موضوع ”انڈیا کی یونیورسٹیوں کا مطالعہ اور اس کا اہتمام و انتظام“ تھا۔ مولانا نے اس سیمینار کی تفصیلی روداد اس میں بیان کی ہے اور خود بھی مولانا نے اس سیمینار میں ”ہندوپاک میں اسلامیات کی درس و تحقیق“ پر مقالہ پیش کیا۔

مولانا اکبر آبادی نے اس سیمینار میں شرکت کے علاوہ میسور کا بھی دورہ کیا جو بنگلور سے ۸۰ میل کی مسافت پر ہے۔ یہاں کے اہم تاریخی مقامات اور تفریحی و سیاحتی مراکز بھی گئے۔ مولانا اس سفر میں مدراس بھی گئے اور انہوں نے یہاں کے علمی اداروں اور کتب خانوں کا احوال اس سفر نامے میں بیان کیا ہے بلکہ اس سفر نامے میں مذکورہ علاقوں کے مسلمانوں کے حالات بھی بیان کئے۔ جس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے مسلمان نہ صرف شاہراہ ترقی پر گامزن ہیں بلکہ مذہبی اور فرقہ وارانہ مناقشات سے بھی محفوظ ہیں۔ مولانا نے اس رائے کا بھی اظہار کیا ہے کہ بھارت کے دیگر خطوں کے مسلمان بھی یہاں کے مسلمانوں کے احوال کو نمونہ عمل بنائیں۔²⁴

۵۔ ”ایران میں چند روز“ کے عنوان سے مولانا اکبر آبادی کا یہ سفر نامہ ایران کی مشہد یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات کے زیر اہتمام مارچ ۱۹۷۰ء میں ایک کانفرنس جو شیخ محمد بن الحسن بن علی بن الحسن الطوسی (۳۸۵ھ - ۴۶۰ھ) کے جشن ہزار کے موقع پر منعقد کی گئی تھی، اس کے احوال پر مشتمل ہے جس میں عالم اسلام کے مختلف نمائندوں کے علاوہ امریکہ، کینیڈا اور یورپ کے نامور مستشرقین²⁵ اور ہندوستان کی طرف سے مولانا اکبر آبادی اور ڈاکٹر محمد اقبال انصاری (ریڈر شعبہ اسلامیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے شرکت کی اور مقالات پیش کئے اور مذاکرات میں حصہ لیا۔ مولانا نے اس کانفرنس کی روداد کا تفصیلی احاطہ اپنے سفر نامہ میں کیا ہے۔ آپ کا قیام ایران میں ۱۵ مارچ سے ۲۶ مارچ ۱۹۷۰ء تک رہا۔ اس مدت میں کانفرنس میں شرکت کے ساتھ ساتھ سیر و سیاحت کا بھی اہتمام کیا۔ ایران کی سرزمین کو اسلامی تاریخ میں سیاسی، مذہبی، علمی اور ادبی حوالوں سے جو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اُس کے آثار ایران کی سرزمین پر چپے چپے میں

موجود ہیں۔ مولانا نے اس سفر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلامی تاریخ کی دینی، علمی اور سیاسی شخصیات کے مزارات کی زیارت کی۔ ان میں امام علی موسیٰ رضا کے روضہ مقدس کی زیارت کے علاوہ عباسی خلیفہ ہارون الرشید کے مقبرے پر بھی گئے اور اس کے مقبرے کی کسمپرسی پر تاسف کا اظہار بھی کیا۔ مولانا نے ضمنی طور پر ہارون کی وفات اور تدفین کے واقعے کا بھی تذکرہ کیا ہے²⁶ جو عبرت و نصیحت کا ذریعہ ہے۔ مولانا نے اپنے ایران کے سفر میں ایران کے کئی تاریخی شہروں کا بھی دورہ کیا ان شہروں میں مشہد، خراسان، طوس، نیشاپور، تہران، قم، شامل ہیں۔ مولانا نے سفر طوس میں امام غزالی کے مقبرے کی تلاش و جستجو بھی کی۔ ایران کا شہر نیشاپور جو علم و ادب، شعر و فن اور فلسفہ و تصوف کا بھی گہوارہ رہا ہے، اس کی سیاسی اور علمی تاریخ کا بھی آپ نے سفر نامہ میں احاطہ کیا ہے۔ مولانا نے نیشاپور میں مدفون علمی و ادبی شخصیات کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ مولانا نے تہران کی شہری اور تجارتی سرگرمیوں کی بھی منظر کشی کی ہے۔ قم میں جناب معصومہ (امام موسیٰ کاظم کی بہن) کے مزار پر بھی گئے۔ مولانا نے اس وقت کی آریہ مہر کے عہد حکومت میں ایرانی قوم کی حب الوطنی اور قوم پرستی کا بھی ذکر اپنے سفر نامہ میں خصوصیت کے ساتھ کیا ہے۔²⁷

۶۔ مولانا کے سفر ناموں میں چھٹا سفر نامہ ”چند روز جاپان میں“ ہے۔ اس سفر نامہ میں مولانا نے جاپان کے شہر کویتو میں ہونے والی ”مذہب اور امن“ پر دوسری عالمی کانفرنس میں زیر بحث موضوع پر پڑھے جانے والے مقالات کا تفصیل سے احاطہ کیا ہے اور ساتھ ہی اس کانفرنس کا مقصد اور اس کا تاریخی پس منظر بھی سفر نامہ میں بیان کیا اور اس کی روداد بھی قلمبند کی ہے اس کانفرنس میں شرکت کے لئے انتالیس ملکوں اور دنیا کے دس بڑے مذاہب کے نمائندے شریک تھے۔ ہندوستان کے وفد میں ۳۵ افراد شامل تھے۔

آپ کو وہاں مقالہ پڑھنے کے بجائے بحث و مباحثہ میں حصہ لینا تھا۔ آپ کا قیام یہاں ۱۱۵ اکتوبر سے ۲۳ اکتوبر ۱۹۷۰ء تک رہا۔ اس دوران اس علمی کانفرنس میں شرکت کے ساتھ آپ کو یہاں کی سیر و سیاحت سے بھی محظوظ ہونے کا موقع ملا۔ جاپان جو دنیا کا ایک قدیم مذہبی ملک ہے۔ مولانا نے یہاں کے مذاہب اور ان کی عبادت گاہوں کا سفر نامہ میں تفصیلی ذکر کیا ہے۔ یہاں کے قدیم مذاہب بودھ مذہب اور ٹائوئزم (TAOISM) اور شنٹوئزم (SHINTOISM) کا آپ نے مشاہدہ کیا اور اس کے ساتھ ساتھ انیسویں صدی کے دو نئے مذہب ٹریکیو (TENRIKYO) اور دوسرا نیا مذہب او موٹو (OOMOTO) کی تاریخ کا بھی احاطہ کیا ہے۔ آپ نے جاپانیوں کی ایک خصوصیت ان کی چمن بندی اور شہر کی آرائش و زیبائش کے لطیف ذوق کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

نارا شہر جو جاپان کا ایک ہزار برس پرانا شہر ہے یہ شہر بھی آپ کو جاپانیوں کے اس ذوق کا منہ بولتا ثبوت نظر آیا جس کا حال آپ نے اپنے سفر نامہ میں بیان کیا۔ جاپان کے شہر کویتو کے بازاروں، پارکوں، سیر گاہوں، ان کے گلی کوچوں کی سیر و سیاحت سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا اور یہاں کے لوگوں کی اپنے وطن سے محبت کو خاص طور پر آپ نے سفر نامہ میں بیان کیا کہ

”ان کو اپنے وطن سے محبت نہیں عشق ہے۔ اپنے وطن کی خاطر وہ ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے ہر وقت آمادہ رہتے ہیں،“²⁸۔

مولانا نے خاص طور پر جاپان میں امن و امان اور جاپانیوں میں قانون کی پابندی کا بالخصوص تذکرہ کیا ہے۔ مولانا نے جاپان کے دار الحکومت ٹوکیو کا بھی دورہ کیا۔ اس شہر کی شان و شوکت، نظم و ضبط، سرتاپا نفاست و لطافت کو نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے اور جاپانیوں کی وقت کی پابندی، ان کی زندگی میں نظم و ضبط کا مشاہدہ کر کے یہ پیغام دیا کہ:

”جو تو میں اپنے آپ کو بنا چاہتی ہیں ان کے لئے جاپان ایک منظم اور منضبط اجتماعی زندگی کی روشن اور قابل تقلید مثال پیش کرتا ہے۔“²⁹

۷۔ مولانا اکبر آبادی کے سفر ناموں میں پاکستان کے سفر نامے بھی شامل ہے۔ مولانا نے پاکستان کے متعدد دورے کئے۔ یہ دورے علمی و تعلیمی مقاصد کے لئے بھی تھے۔ آپ نے پاکستان میں منعقدہ مختلف کانفرنسوں اور سیمینار میں شرکت کی اور پاکستان کے دورے کی غرض و غایت اپنے اعزہ واقارب سے ملاقات بھی تھی۔ مولانا نے پاکستان کے دورے مختلف زمانوں میں کئے۔ پہلا دورہ اُس وقت کیا جب پاکستان میں وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو تھے اور ایک سے زائد دورے جنرل ضیاء الحق کے عہد حکومت میں کئے۔ چنانچہ ان دوروں کی تفصیلات اپنے سفر نامے میں بیان کیں، ان ادوار کے سفر ناموں کے اُمور و مسائل ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مولانا نے اپنے دورہ پاکستان میں پاکستان کے سیاسی نظام کو خاص طور پر موضوع بحث بنایا ہے انہوں نے پاکستان میں سوشلزم اور اسلامائزیشن کے موضوع پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ ان سفر ناموں میں مختلف علمی شخصیات سے ملاقات اور نجی ملاقاتوں اور مجلسوں کا احوال بھی بیان کیا ہے۔ مولانا نے پاکستان کی ترقی اور قدرتی مناظر کو بھی سفر نامے میں قلمبند کیا۔ پاکستان سے متعلق سفر نامے بُرہان میں تین مختلف عنوانات (جس کا ذکر مولانا کے سفر ناموں کی فہرست میں کیا جا چکا ہے) سے شائع ہو چکے ہیں۔

۸۔ ”میسور میں دو دن“ مولانا اکبر آبادی کا یہ سفر نامہ میسور یونیورسٹی کے صدر شعبہ کی طرف سے ماڈرن عربک لٹریچر پر ایک توسیعی لیکچر کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ آپ کا پہلے بھی بنگلور میں ایک اہم سیمینار (جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے) کے موقع پر یہاں آنا ہوا تھا، اب دوسری بار آپ نے یہ سفر بذریعہ بس کیا۔ راستے کے خوبصورت مناظر کی عکس بندی آپ نے نہایت خوبصورتی سے سفر نامہ میں بیان کی ہے۔ سرنگاپٹم میں سلطان ٹیپو اور ان کے خاندان کے مقبرے ہیں۔ ان کی زیارت کا حال بھی آپ نے سفر نامہ میں بیان کیا ہے۔ سلطان کا بنایا ہوا قلعہ جس میں انگریزوں سے جنگ کرتے ہوئے جام شہادت نوش کی، اس جگہ کو دیکھ کر اپنے مشاہدات و تاثرات بھی اپنے سفر نامہ میں بیان کئے۔³⁰

اگرچہ یہ ایک علمی سفر تھا لیکن اس علمی سفر میں بھی فطرت کے جمال و نزہت اور یہاں کے تاریخی مقامات کو دیکھنے کا موقع ملا، جس کی رُو داد آپ نے اپنے سفر نامہ میں قلمبند کی ہے۔

۹۔ مولانا اکبر آبادی کے سفر ناموں میں ایک سفر نامہ ”کلکتہ میں دس دن“ کے عنوان سے بھی ہے۔ یہ سفر نامہ کلکتہ میں قائم ایک عظیم الشان علمی انجمن ”ایران سوسائٹی“³¹ کی مجلس منتظمہ کی طرف سے ڈاکٹر محمد اسحاق مرحوم کی یاد میں ڈاکٹر محمد اسحاق میموریل لیکچر کے لئے آپ کے مدعو کئے جانے اور اس لیکچر کی تمام کاروائی کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ اس سفر نامہ میں آپ نے اہم شخصیات سے ملاقاتوں کا احوال اور ان سے علمی گفتگو کی تفصیلات بھی بیان کی ہیں۔

مولانا اکبر آبادی کے ان سفر ناموں کے اجمالی جائزے کے بعد یہاں ہم مذکورہ سفر ناموں کی خصوصیات بھی مختصراً بیان کریں گے۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے سفر ناموں کی خصوصیات

۱۔ مولانا اکبر آبادی کے سفر نامے متنوع علمی و ادبی خصوصیات کے حامل ہیں۔ ان سفر ناموں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ حقیقت پر مبنی اور مبالغہ آرائی سے پاک ہیں۔ ان کا اسلوب بیان سادہ اور برجستہ ہے۔ جس کے باعث وہ قاری کو اپنا ہم خیال بنا لینے کی مکمل قدرت اور صلاحیت رکھتے ہیں۔ آپ کی اس خصوصیت کا اندازہ آپ کے سفر نامہ ”چند روز جاپان میں“ کے درج ذیل اقتباس سے کیا جاسکتا ہے جو مبالغہ آرائی سے پاک اور سیدھے سادے انداز میں حقیقت پسندی پر مبنی ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

”گذشتہ ماہ اکتوبر میں جاپان کے مشہور شہر کوسٹو میں ایک نہایت عظیم الشان عالمی کانفرنس ”مذہب اور امن“ پر منعقد ہوئی۔ اس میں میری شرکت کی ترکیب یہ ہوئی کہ غالباً فروری ۱۹۷۰ء میں محترم و مکرم جناب خواجہ غلام السیدین صاحب جو ہندوستان کے نمائندہ کی حیثیت سے کانفرنس کی مجلس عاملہ کے ایک باوقار اور بااثر ممبر ہیں انہوں نے مجھ کو لکھا کہ اس مرتبہ کانفرنس اکتوبر میں جاپان میں ہو رہی ہے اور وہ ہندوستان کے مندوبین میں میرے نام کو بھی شامل کرنے کی سفارش کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے جواب میں جناب موصوف کا شکریہ ادا کیا اور لکھا کہ بہت اچھا۔ اگر مجھ کو دعوت ملی تو میں منظور کر لوں گا۔ مہینہ ڈیڑھ مہینہ کے بعد کانفرنس کے صدر اور کانفرنس کی ہندوستانی شاخ کے صدر ڈاکٹر رادھا کرشن کی طرف سے باقاعدہ دعوت نامہ بھی آگیا لیکن اس میں لکھا تھا کہ چونکہ کانفرنس میں کم و بیش تین سو بیرونی نمائندوں کی شرکت متوقع ہے اس بناء پر کانفرنس صرف ایک طرف کا ہوائی جہاز کا کرایہ دے سکے گی۔ دوسری طرف کا کرایہ خود دینا ہو گا یا کسی اور ادارہ سے اس کا انتظام کرنا ہو گا۔ میں نے یہ دعوت قبول کر لی۔ لیکن ساتھ ہی تحریر کیا کہ دوسری طرف کا کرایہ نہ میں خود دے سکتا ہوں اور نہ میں کسی ادارہ سے اس کی درخواست کر سکتا ہوں۔ اس لئے اگر کانفرنس ہی میرے آمد و رفت کے کرایہ کا انتظام کر سکتی ہے تو خیر! ورنہ میری طرف سے معذرت! اس کے جواب میں ڈاکٹر رادھا کرشن نے جو گاندھی پیس فاؤنڈیشن نئی دہلی کے سکریٹری بھی ہیں لکھا کہ ”ہم اپنے ہاں مجلس عاملہ کی میٹنگ میں غور کریں گے اور جو فیصلہ ہو گا آپ کو اس سے مطلع کر دیں گے۔“ اس کے بعد اس ”فیصلہ“ کی تو کوئی اطلاع ملی نہیں البتہ ہندوستان سے ڈیلی گیٹیشن کے جانے کے سلسلے میں جو تیاریاں ہو رہی تھیں ان سے مجھ کو برابر باخبر رکھا گیا۔ اسی اثناء میں خواجہ غلام السیدین صاحب کینیڈا اور یورپ کے ایک طویل دورے پر ہندوستان سے باہر چلے گئے تھے۔ جب وہ واپس آگئے تو میں نے غالباً اگست میں ان کو لکھا کہ کانفرنس کے انعقاد میں صرف دو مہینے باقی رہ گئے ہیں اور مجھے اب تک یہ نہ معلوم ہو سکا کہ میں جاسکوں گا یا نہیں۔ اور یہ میں اس غرض سے پوچھتا ہوں کہ اگر جانا ہو تو میں مقالہ لکھوں۔ موصوف نے حسب عادت فوراً جواب دیا اور لکھا: کانفرنس تو پورا کرایہ دینے سے معذور ہے۔ البتہ میں آپ کی یونیورسٹی (علی گڑھ) کے وائس چانسلر (ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب) کو لکھ رہا ہوں کہ وہ یونیورسٹی کی طرف سے آپ کے لئے نصف یعنی ایک طرف کے کرایہ کا انتظام کر دیں۔ رہا مقالہ تو آپ کو وہاں مقالہ نہیں پڑھنا ہے۔ بلکہ صرف بحث و مباحثہ میں حصہ لینا ہے۔ اس خط کے بعد میں مطمئن ہو کر بیٹھ گیا کہ مقالہ لکھنا تو ہے نہیں۔ اب جانا ہوا تو فیہا اور نہ جانا ہوا تو کیا غم! سیدین صاحب نے یہ بھی لکھا تھا کہ ”میں اس معاملہ میں خود بھی وائس چانسلر صاحب سے گفتگو کر لوں۔ لیکن افسوس ہے میں اس کی تعمیل نہیں کر سکا۔ کیوں کہ گفتگو کے معنی درخواست کے تھے اور اللہ کا ہزار ہزار شکر و احسان ہے کہ اس نے

اپنے حبیب پاک کے صدقے میں مجھ کو اس ننگ سے محفوظ رکھا ہے۔“³²

مولانا کی حقیقت پسندی اور سادگی کی اس خصوصیت کا اظہار ”سفر نامہ پاکستان“ کے اس اقتباس سے بھی ہوتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں: ”لاہور ایئر پورٹ پہنچا تو حسب توقع میاں اسلم، ربیعانہ (بیٹی اور داماد) اور ان کے پھول سے چاروں بچے موجود تھے۔ نافع تو ابھی گود میں ہے صرف ہمکنہ جانتا ہے۔ سب سے بڑا بچہ ظفر پہلے شریہ تھا اب سنجیدہ ہو گیا ہے۔ ان دونوں کے بیچ میں دو لڑکیاں ہیں۔ ایک کا نام زمیلہ ہے اور دوسری کا انجم، دونوں بچیوں کو نانا سے بڑی محبت ہے مجھے دیکھتے ہی دوڑی ہوئی آئیں اور لپٹ گئیں۔ ان سب کے ساتھ پنجاب یونیورسٹی کی پرانی بلڈنگ میں آیا۔ یہاں دو دن سے آل پاکستان ہسٹری اینڈ کلچر ایسوسی ایشن کی بین الاقوامی کانفرنس ہو رہی تھی۔ میاں اسلم اس کے کرتادھر تاتو تھے ہی (پنجاب یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر تھے) انہوں نے مجھ کو بھی اس کا ایک مندوب بنا دیا تھا اور اس حیثیت سے مندوب کا بیچ اور دوسری چیزیں مجھے مل گئی تھیں۔ اسی رواروی میں کانفرنس کے لئے میں مقالہ تو کیا لکھتا اس سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ کانفرنس میں شریک ہو کر بعض اچھے اچھے مقالات سن لئے۔ اور ان پر جو مذاکرہ ہوا ان سے لطف اندوز ہوا اور پاکستان کے تاریخ کے پروفیسروں اور اساتذہ کے علاوہ اپنے بعض دیرینہ دوستوں سے یکجا ملاقات بھی ہو گئی۔“³³

اسی طرح ایک اور اقتباس سے جو سفر نامہ ”کلکتہ میں دس دن“ سے ہے اُس سے بھی آپ کی یہ خصوصیت جھلکتی ہے۔ آپ کہتے ہیں: ”کلکتہ میں میری زندگی کے دس برس (از فروری ۱۹۴۹ء تا جون ۱۹۵۹ء) گزرے ہیں۔ میں علمی، ادبی، سماجی اور تعلیمی اعتبار سے ان دس برسوں کو اپنی عمر کے بہترین ادوار میں سے ایک دور سمجھتا ہوں اس دور میں، میں نے کلکتہ اور اہل کلکتہ کو کیا دیا، یہ تو ان کے بتانے کی چیز ہے۔ البتہ مجھ کو اس کا شکر گزاری کے ساتھ اعتراف ہے کہ کلکتہ نے مجھ کو قلبی اور مخلصانہ محبت دی، زندگی کا عملی تجربہ دیا، فکر و نظر کی بلندی دی، علمی اور تحقیقی ذوق کی چنگی بخشی، ادبی، شعری اور جمالیاتی رجحان طبع کو جلادی اور عزت و احترام کا وہ مقام دیا جو کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ ایک طرف اپنے عہدہ کی وجہ سے سرکاری حلقوں میں میری پرسش تھی اور سرکاری پارٹیوں میں شریک ہوتا تھا تو دوسری جانب مسلمانوں کے ہر طبقہ سے میرے مخلصانہ اور دوستانہ تعلقات تھے۔ جب تک کلکتہ میں رہا ایشیائی سوسائٹی کلکتہ کی کونسل کا ممبر اور فائیو لو جیکل سیکریٹری رہا۔ مسلم انسٹیٹیوٹ کا نائب صدر، انجمن ترقی اُردو کا صدر اور دوسرے علمی اور تعلیمی اداروں سے وابستہ رہا۔ اس بناء پر کلکتہ کے بڑے بڑے غیر مسلم ارباب علم و فضل اور مصنفین و محققین سے بھی راہ و رسم رہی اور ان کے ساتھ مختلف موضوعات پر بارہا علمی گفتگوؤں کا اور ان کے حسن اخلاق و کردار سے متاثر ہونے کا موقع ملا۔ ان وجوہ سے نہ میں نے کلکتہ کو اب تک فراموش کیا ہے اور نہ کر سکتا ہوں اور چونکہ محبت کبھی یکطرفہ نہیں ہوتی اس لئے نہ کلکتہ نے اب تک مجھ کو دل سے بھلایا ہے۔ میں ادھر چند برسوں سے کلکتہ گیا بھی نہیں تھا اس لئے اب ایران سوسائٹی کی یہ دعوت ملی تو اس کے قبول کر لینے میں کیا عذر ہو سکتا تھا۔ میں نے فوراً اسے منظور کر لیا۔“³⁴

(اس سفر نامہ میں مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ اپنے کلکتہ میں گزارے ان دس برسوں کا ذکر کر رہے ہیں جب مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم ہند کی تحریک و سفارش پر مولانا اکبر آبادیؒ کو کلکتہ کے عالی وقار اور عظیم الشان مدرسہ عالیہ کا پرنسپل مقرر کیا گیا تھا)

۲۔ مولانا کے سفر نامے کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ جو کچھ دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں اسے بلا کم و کاست بیان کر دیتے ہیں زیب داستانی مولانا کے سفر ناموں میں نہیں ہے۔ آپ کی یہ خوبی جا بجا آپ کے سفر ناموں میں نظر آتی ہے جیسے اپنے سفر نامہ ”پاکستان میں

بین الاقوامی سیرت کانفرنس اور میرے مشاہدات و تاثرات“ میں آپ نے پشاور کی آب و ہوا کی معجزہ نمایاں جو محسوس کیں وہ آپ نے اس طرح بیان کی ہیں:

”میں اس زمانہ میں کالج میں تھا اور میرا اصل کھانا صرف ایک وقت یعنی شام کا رہ گیا تھا۔ صبح کا ناشتہ اور دوپہر کا لچ ان کا گزارہ صرف دو توں اور ایک فرائڈ انڈے پر تھا (یہ مولانا اس وقت کی بات کر رہے ہیں جب آپ نے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ۱۹۳۰ء میں پرائیوٹ السنہ شریعہ کے امتحانات پاس کیے پھر ۱۹۳۴ء میں اسی یونیورسٹی سے انگریزی کے امتحانات پرائیوٹ دیے) مگر اب سنیے کہ پشاور پہنچتے ہی کیا انقلاب آگیا جس روز میں پشاور پہنچا اسی روز شام کو عبدالحق کار میں اپنے ساتھ تفریح کے لئے لے گئے۔ میں نے بازاروں میں نہایت اعلیٰ درجہ کے شیریں اور ٹھنڈے سیاہ انگور اور سردے دیکھے تو اپنے میزبان سے کہا ”اب میرا معمول یہ رہے گا کہ شام کو صرف انگور اور سردہ خوب پیٹ بھر کر کھاؤں گا اور اس کے علاوہ کچھ اور نہیں۔“ عبدالحق یہ سن کر ہنسے اور بولے کہ دیکھئے! اپنے قول و قرار پر قائم رہئے گا۔ میں نے کہا ضرور! اس قرار داد کے مطابق ٹوکڑہ میں بھرے ہوئے انگور اور سردے آگئے۔ میں نے شکم سیر ہو کر کھائے، مگر ایک گھنٹہ کے بعد ہی سخت بھوک لگنے لگی۔ ڈرتے ڈرتے اس کا اظہار کیا تو کھانا میز پر لگ گیا۔ بھوک سخت تھی اس لئے کھانے میں کوئی کوتاہی نہیں ہوئی، کھانے سے فراغت کے بعد عبدالحق کار میں تھہ خوانی بازار لے گئے اور وہاں ایک دوکان میں ہم نے ایک ایک پلیٹ تنکے کے کبابوں کی کھائی اور ایک ایک براد سبز چائے کا پیا۔ ان سب بے عنوانیوں کے باوجود جب صبح کو اٹھا تو طبیعت نہایت ہلکی پھلکی اور شاداں و فرحاں تھی۔ اس کے بعد سے میرا معمول یہ ہو گیا کہ جب تک صوبہ سرحد میں رہا چار وقت شکم سیر ہو کر کھانا کھاتا تھا۔ جس میں مرغ و ماہی لازمی طور پر شامل ہوتے تھے۔ یہاں میرا قیام کم و بیش ایک ماہ رہا ہو گا۔ اسی درمیان میں خیبر پاس بھی گیا اور ایک پورا دن قبائل آزاد کے ساتھ گزارا۔ چند روز کے لئے اسلام آباد میں آکر ٹھہرا، شید و میں کئی دن قیام کیا، نوشہرہ گیا، اُس کی سیر کی، مردان گیا اُس کی سیر سے متمتع ہوا۔ ایک مہینہ میں حالت کچھ سے کچھ ہو گئی۔ مجھ کو یقین ہے کہ ہزار دو انہیں ایک طرف اور پشاور کے کسی صاف ستھرے اور کشادہ علاقہ میں کم و بیش ایک ماہ قیام ایک طرف۔“³⁵

”ایران میں چند روز“ اس سفر نامہ کے ایک اقتباس سے بھی آپ کی اس خصوصیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آپ نے وہاں جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا اس کو بغیر کسی زیب داستانی کے اس طرح بیان کیا ہے:

”اول تو ایران میں قیام مختصر ہی رہا اور جتنے دن رہا بھی ان میں مصروفیت رہی۔ پھر اسی زمانے میں نوروز کی تعطیلات کے باعث یونیورسٹیاں، دوسرے تعلیمی ادارے حکومت کے دفاتر وغیرہ سب ہی بند تھے۔ اس بناء پر ملک کے اقتصادی، تعلیمی اور سماجی حالات کو تفصیل سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ البتہ ایک مسافر کی حیثیت سے جو کچھ دیکھا اور مختلف حضرات سے گفتگو کر کے جو معلومات حاصل ہوئیں اور وہاں کے اخبارات میں جو چیزیں نظر سے گزریں ان کی روشنی میں یہ بات بے تکلف کہی جاسکتی ہے کہ ایران کی موجودہ حکومت نے عملاً اس عام فکر و خیال کی پر زور تردید کر دی ہے کہ بس جمہوریت ہی ملک کی ترقی، عوام کی فلاح و بہبود اور قوم کی رفاهیت و خوش حالی اور امن و امان کی کفیل اور ضامن ہے۔ کیونکہ حکومت کی عنان شخص واحد کے ہاتھ میں ہو یا عوام کی نمائندہ ایک جماعت اور پارٹی کے ہاتھ میں۔ بہر حال دونوں ہوتے ہیں انسان ہی اور جس طرح ایک شخص اچھا یا بُرا ہو سکتا ہے اسی طرح ایک پارٹی پر بھی اچھے اور بُرے لوگوں کا غلبہ

ہو سکتا ہے بلکہ حق یہ ہے کہ اگر کسی حکمران پارٹی پر بڑے لوگوں کا غلبہ ہو جائے تو وہ ملک کے لئے ایک بڑے شخص واحد کی حکومت سے کہیں زیادہ تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے بہر حال موجودہ شہنشاہ ایران آریہ مہر کے عہد حکومت میں ایران نے ہر اعتبار سے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ گذشتہ دس برس میں قومی آمدنی میں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے لوگوں کا معیار زندگی کتنا بلند ہو گیا ہے اس کا اندازہ اس ایک بات سے ہو سکتا ہے کہ پورے ملک کی آبادی دو کروڑ سے بھی کم ہے لیکن اس کے باوجود صرف ایک شہر تہران میں تین لاکھ کے قریب کاریں ہیں اور وہ بھی اعلیٰ اور عمدہ قسم کی۔ شہنشاہ کو سب سے زیادہ توجہ تعلیم کی طرف ہے۔ اس بناء پر ہر صوبہ میں کم از کم ایک مکمل یونیورسٹی ہے اور ہر یونیورسٹی میں ایک شعبہ دینیات جس کو وہاں الہیات کہتے ہیں ایسا ہی ترقی یافتہ ہے جیسے علوم و فنون اور سائنس و ٹیکنالوجی کے شعبے، طلباء کے لئے کثرت سے وظائف اور ان کی راحت و آسائش کے اعلیٰ انتظامات کے علاوہ اساتذہ اور تحقیق و تصنیف و تالیف کے کاموں کی حوصلہ افزائی کا عالم یہ ہے کہ وہاں پروفیسر کی تنخواہ پانچ ہزار تومان (ایک تومان ہمارے روپے سے کچھ زیادہ ہوتا ہے) سے لے کر چھ ہزار تومان تک ہوتی ہے۔ ریڈر اور لیکچرار کی تنخواہوں کو اس پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔ علاوہ ازیں ایک پروفیسر کو پانچ ہزار تومان سالانہ خرید کتب کے لئے ملتے ہیں اور ایک کتاب لکھنے پر پانچ ہزار تومان الگ۔ یہی سبب ہے کہ صرف ایک تہران یونیورسٹی کی طرف سے کم و بیش ایک سو کتابیں سالانہ شائع ہونے کا اوسط ہے پھر کتابیں بھی کس اہتمام سے شائع ہو رہی ہیں اور کیسی کیسی بلند پایہ اور محققانہ کہ سجان اللہ، صل علیٰ دیکھنے اور دیکھتے رہنے اور پڑھنے تو دل اور دماغ دونوں روشن، پروفیسروں کے لئے مراعات اور ان کی نگہداشت کی حد یہ ہے کہ جب ایک پروفیسر مدت ملازمت پوری کرنے کے بعد اپنے عہدہ سے سبکدوش ہوتا ہے تو اس کو جو پنشن ملتی ہے وہ اس کی اصل تنخواہ سے بھی زائد ہوتی ہے یعنی چھ ہزار پانچ سو تومان ماہانہ۔ یہی وجہ ہیں جن کے باعث ایران کا اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور قابل شخص ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ لوگوں کی طرح نہ امریکہ اور کینیڈا کی راہ لیتا ہے اور نہ مشرق وسطیٰ اور افریقہ کے کسی ملک میں پہنچ جانے کی تمنا کرتا ہے۔ بلکہ اپنے ملک میں رہ کر وطن اور بنائے وطن کی خدمت کو اپنا فرض جانتا ہے۔“³⁶

آپ کی اس خصوصیت کا اندازہ کہ جو دیکھتے ہیں وہی سادہ انداز میں بیان کر دیتے ہیں۔ آپ کے ایک اور سفر نامہ ”دیوارِ غرب کے مشاہدات و تاثرات“ کی اس تحریر سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ:

”میں نے کینیڈا کے مذہبی لوگوں میں دو باتیں خاص طور پر نوٹ کیں۔ جنہوں نے مجھ کو بہت متاثر کیا ہے ایک یہ کہ چونکہ یہاں دکھاوا، ریاکاری اور تصنع اور بناوٹ ہے ہی نہیں، جو بات ہے صاف اور بلاغاً و غش ہے اس لئے یہاں جو رند ہے (اور تعداد انہی کی زیادہ ہے) وہ کھلا ہوا رند ہے، اسی طرح جو پارہا ہے وہ ظاہر و باطن دونوں کے اعتبار سے یکساں ہے۔ رند کا اصل حال تو خدا ہی جانتا ہے لیکن جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے جو لوگ مرد ہوں یا عورت شروع ہی سے مذہب کی خدمت کو اپنا مقصد زندگی قرار دے لیتے ہیں وہ بڑی سادگی سے رہتے ہیں، خلوص اور تندہی سے کام کرتے ہیں، جفاکشی سے گھبراتے نہیں اور دنیاوی عیش و آرام سے بے نیاز ہو کر رہتے ہیں۔ یہ مذہب کو حصول جاہ و منصب کا آلہ و وسیلہ نہیں بناتے، نذرانے نہیں لیتے، چہار گونہ یا پنج گونہ سفر خرچ وصول نہیں کرتے۔ انہیں اپنے کام سے کام ہوتا ہے۔ وہ رقص و سرور کے مجالس شبانہ یا حسن عریاں و بے حجاب کی جلوہ گاہوں میں نظر نہیں آئیں گے۔ یہ عبادت کریں گے تو خالص عبادت کی غرض سے، حج اور اسمگلنگ کی نیت سے! شاید وہاں اس کا تصور بھی نہیں ملے گا۔ یہ لوگ اپنے مذہب کی

خدمت اور تبلیغ کرتے ہیں تو صرف زبان سے ہی نہیں بلکہ علم، عمل اور خدمت ان تینوں کے ذریعے کرتے ہیں۔ خدمت کے لئے فروتنی، بے نفسی اور انکساری ضروری ہے۔ یہ تینوں صفات ان کے اندر ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ دوسری بات یہ ہے کہ وہاں کا "مولوی" انرا مولوی نہیں ہوتا۔ وہ اپنے مذہب کے علاوہ دوسرے مذاہب کا بھی تقابلی مطالعہ کرتا ہے، مذہبی علوم فنون کے ساتھ علوم جدیدہ بھی حاصل کرتا ہے اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ان علوم میں ورک اور کمال پیدا کرتا ہے چنانچہ مشنریز میں کام کرنے والوں میں آپ کو انجینیئر بھی ملیں گے، پروفیسر بھی نظر آئیں گے، اور بیرسٹر بھی۔ جو علوم و فنون کا حال ہے وہی زبانوں کا ہے۔ یہ لوگ کئی کئی زبانیں جانتے ہیں اور صرف شہد کی حد تک نہیں بلکہ ان میں بولتے ہیں، تقریر کرتے اور لکھتے ہیں۔“³⁷

۳۔ مولانا ایک وسیع المطالعہ علمی شخصیت تھے اس لئے وہ صرف وہی کچھ بیان نہیں کرتے جو دیکھتے ہیں بلکہ ان علاقوں کی تاریخ پر بھی نظر ڈالتے ہیں۔ ان ممالک کے تاریخی و تہذیبی پس منظر سے قاری کو روشناس کراتے ہیں۔ آپ کی اس خصوصیت کی جھلک آپ کے سفر نامہ ”چندر و زمینی تال میں“ کے اس اقتباس سے ہوتی ہے۔ آپ نینی تال کے خوبصورت مناظر کا ذکر کرتے ہوئے اس کی تاریخ بھی بیان کرتے ہیں: ”نینی تال اپنے خوبصورت مناظر کے اعتبار سے ہندوستان کے پہاڑوں میں نہایت ممتاز حیثیت رکھتا ہے جو لوگ یورپ ہو آئے ہیں، کہتے تھے کہ سوئٹزرلینڈ اور کشمیر کی بعد ایسے مناظر کہیں نہیں ہیں لیکن یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ہندوستان کی اس ملکہ حسن و جمال کا کھوج سب سے پہلے ایک انگریز نے ہی لگایا ۱۸۱۵ء سے ۱۸۴۱ء تک برطانوی فوجیں الموڑہ آنے جانے میں نینی تال کے مشرق اور مغرب چند میل کے فاصلہ سے گزرتی تھیں۔ لیکن ان کو بھی معلوم نہیں تھا کہ ان کی گزرگاہ سے چند میل دور ایک نہایت ہی خوبصورت تال ہے جس کو فطرت کی گلکاری کا ایک نقش بوقلموں کہا جاسکتا ہے۔ سب سے پہلے اس کا سراغ ایک انگریز مسٹر بیرن (Barron) کو ملا جو ضلع شاہجہاں پور کا ایک سوداگر تھا۔ اس نے ۱۸۴۱ء میں دنیا کو اس سے باخبر کیا۔ ۱۸۴۳ء سے یہاں مکانات بننے شروع ہو گئے۔ سب سے پہلا مکان جو یہاں تعمیر ہوا، بیرن کا ہی تھا۔ میں نے وہ خود نہیں دیکھا، لوگ کہتے تھے کہ وہ اب بھی کلب پر موجود ہے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد نینی تال صوبہ یوپی کے گورنر کا (Summer Headquarter) بن گیا۔ ۱۸۶۲ء میں لفٹنٹ گورنر کا بنگلہ یہاں پہلی مرتبہ تعمیر ہوا۔ آج کل جس مقام پر ریمزے ہاسپٹل ہے وہ بنگلہ یہیں تھا۔ پھر ۱۹۰۰ء میں سر اینتھونی مکڈانلڈ کے عہد گورنری میں موجودہ گورنمنٹ ہاؤس اور سکریٹریٹ کی عمارتیں بنیں۔“³⁸

سفر نامہ ”ایران میں چند روز“ میں مشہد کے مذہبی و تاریخی مقامات دیکھنے کے ساتھ ساتھ اس شہر کی تاریخ بھی بیان کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں: ”موجودہ زمانہ میں جو اہمیت مشہد کی ہے وہ ایران کے کسی اور شہر کی نہیں۔ یہ شہر جو ایران کے شمال مشرقی حصہ میں واقع اور سطح سمندر سے تین ہزار دو سو فٹ بلند ہے خراسان کے صوبہ کا دارالحکومت ہے بلکہ ایک زمانہ میں تو پورے ملک کا دارالسلطنت بھی تھا۔ یہاں کی آب و ہوا ایسی معتدل اور خوشگوار ہے کہ گرمیوں میں لوگ عام طور پر تبدیلی آب و ہوا اور شدتِ گرما سے بچنے کے لئے یہاں آتے ہیں۔ موجودہ شہر ایک بالکل ماڈرن اور عہد جدید کا تعمیر شدہ ہے۔ اسلامی تاریخوں میں طوس جس شہر کا نام آتا ہے وہ دراصل یہی تھا اور اب بھی موجودہ شہر کے دو محلے نوغان اور سنا باد اسی قدیم شہر کی یادگاریں ہیں۔ تیموری سلطنت کے زمانے میں جب طوس برباد ہو گیا اور اس کے بعد شہر کو از سر نو آباد کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تو شہر کے ایک ٹکڑے کو طوس کے نام سے الگ کر دیا گیا جو اب بھی موجود ہے اور باقی شہر کو مشہد

کے نام سے از سر نو بسایا گیا۔ اس نام کی وجہ یہ ہے کہ شیعہ حضرات کے آٹھویں امام حضرت علی بن موسیٰ رضانے اسی شہر میں زہر کھا کر جام شہادت نوش کیا تھا اور یہیں دفن ہوئے تھے۔ اس مقبرہ کی وجہ سے شہر میں تقدس کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ دنیا کے مختلف گوشوں سے مرد اور عورت، حاجی اور زائر یہاں برابر آتے رہتے اور برکت حاصل کرتے ہیں۔³⁹

اسی سفر نامہ میں ایران کے شہر نیشاپور کی تاریخ اس طرح بیان کی۔ آپ کہتے ہیں:

”اس شہر کو تاریخ اسلام میں جو اہمیت و شہرت حاصل ہے وہ اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ یہ شہر علم و ادب، شعر و فن اور فلسفہ و تصوف کا گہوارہ رہا ہے اور ساتھ ہی ایک سیاسی مرکز بھی۔ چنانچہ ابو مسلم خراسانی جس نے بنو امیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا۔ اس کا مرکز بھی شہر تھا۔ وہ یہاں ۱۳۱ھ میں داخل ہوا اور ایک مسجد کی تعمیر کی۔ ابو مسلم کے بعد اس شہر کی شہرت طاہر بن حسین کی وجہ سے ہوئی جس کا لقب ذوالیمینین تھا۔ یہ اگرچہ مامون الرشید کی طرف سے مشرقی ایران کا گورنر تھا لیکن باغی ہو کر اس نے خود اپنی حکومت قائم کی اور نیشاپور کو دار الحکومت قرار دیا۔ یہ حکمران خاندان اس کی نسبت سے طاہر یہ کہلاتا ہے۔ ۲۷۹ھ میں صفاریوں نے طاہر یہ کو شکست دے کر حکومت پر قبضہ کر لیا۔ لیکن جب سامانیوں کا دور حکومت آیا تو انھوں نے نیشاپور کے بجائے بخارا کو دار الحکومت بنایا۔ اس زمانہ میں نیشاپور کی سیاسی حیثیت اگرچہ کمزور ہو گئی تھی لیکن علم و ادب میں اس کی ترقی کا خاص زمانہ یہی ہے۔ دولت غزنویہ کے زوال تک اس کا حال یہی رہا۔ اس کے بعد سلجوقیوں کا عہد شروع ہوا تو نیشاپور کو علمی اور سیاسی دونوں حیثیتوں سے عروج حاصل ہوا۔ سلطان طغرل کا نیشاپور میں ورود ۳۲۹ھ میں ہوا اور اس نے اس کو اپنا دار الحکومت بنا لیا۔ الپ ارسلان بھی ایک عرصہ تک یہاں مقیم رہا۔ الپ ارسلان اور ملک شاہ کے زمانہ میں نیشاپور نے وہ ترقی کی کہ عالم اسلام میں اس کا طوطی بولنے لگا۔ لیکن چنگیز خان کے عہد میں اس کو عظیم نقصان پہنچا۔ چنگیز کے لڑکے تو لوٹنے شہر پر قبضہ کر کے قتل عام اس درجہ کیا کہ صرف چار سو کارگر محض اپنے ہنر کے باعث محفوظ رہ سکے۔ صفوی عہد سلطنت کے آغاز میں افغانہ کی طرف سے پھر اس پر پے پے حملے اس درجہ شدید ہوئے کہ اینٹ سے اینٹ بج گئی اور ایک مکان بھی قابل رہائش نہیں رہا۔ فریزر ۱۸۲۱ء میں یہاں آیا تھا اس کا بیان ہے کہ اس سال نیشاپور میں رہنے والوں کی تعداد پانچ ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔

یہ نیشاپور کی قدیم تاریخ ہے آج وہ متوسط درجہ کا اچھا خاصا شہر ہے۔ مشہد سے ۱۳۷ کیلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔ راستہ پہاڑیوں کے درمیان سے گزرتا ہے۔ اس لئے پُراز نشیب و فراز بھی ہے اور خوبصورت بھی۔ درمیان میں دریائے ساوہ بھی پڑا جس کا تاریخ میں ذکر آتا ہے۔ جن پہاڑوں کے درمیان سے ہماری بسیں گزر رہی تھیں یہ وہی پہاڑیاں ہیں جن سے نکل کر حملہ آوروں نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا حملہ کو جو چاہے کہہ لیجئے لیکن ان افغانوں اور مغلوں کی ہمت و شجاعت اور مردانگی کی داد لازمی طور دینی پڑتی ہے۔⁴⁰

۴۔ مولانا کے سفر ناموں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ارد گرد کے ماحول اور مناظر میں قاری کو بھی شریک مطالعہ کر لیتے ہیں وہ ان علاقوں کی خوبصورتی، صفائی اور نظم و ضبط کا حال بھی تحریر کرتے ہیں۔ مثلاً مولانا نے اپنے سفر نامہ ”چندر و زمنی تال میں“

نینی تال کی چاندنی رات کی عکاسی انتہائی خوبصورت انداز میں کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”مغرب کے بعد جب رنگ برنگ کی روشنیوں کا انعکاس تال میں ہوتا ہے تو عجیب و غریب نظر آتا ہے بالکل ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جا بجا پانی کے نیچے قوس قزح لگی ہوئی ہے اور پھر اگر چاندنی رات بھی ہو تو کچھ نہ پوچھیے۔ حُسنِ فطرت کی یہ شرابِ ارغوانی دو آتشہ بلکہ

سہ آتش بن جاتی ہے۔ بل کھاتی ہوئی موجوں میں چاند کا عکس پڑتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا تال کی موجیں اپنی گود میں چاند کو جھکولے دے رہی ہیں اور سکون کے وقت محسوس ہوتا ہے کہ نرم نرم موجوں نے چاند کو لوریاں دے دے کر اپنی آغوش میں سُلا لیا ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کی وہ امواج رقصاں سے چھیڑ چھاڑ، لہروں کا طفلانِ شوخ و شنگ کی طرح آپس میں وہ کلیلیں کرنا اور چاروں طرف اونچی اونچی پہاڑوں کا چاندنی کی سفید چادر کو اوڑھے ہوئے ایک ثابت قدم مرد مجاہد کی طرح کھڑے رہنا، چاند کا موجوں کی آغوش میں یوں جھولے جھولنا، رات کی خاموش فضا میں کہیں کہیں سے نغمہ و سرور کی آواز کا آنا، پانی کی مستانہ روش سے ہلکے ہلکے ترنم کا پیدا ہونا۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جو دراصل غالب کی زبان میں ”جنت نگاہ و فردوس گوش“ ہیں اور جو لمحات ان جاں فروز مناظر کی رفاقت و معیت میں بسر ہوں۔ بے شبہ حیات نشاط کی روح پر فتوح کہلانے کے مستحق ہیں۔ آدمی جب مادیت کے دام بلا میں گرفتار ہو جاتا ہے تو وہ اپنی کج نظری کے باعث صرف اُن چیزوں کو سرمایہ نشاط و سرور سمجھتا ہے جن سے گو تھوڑی دیر کے لئے جسمانی حظ ضرور حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن نتیجتاً وہ اس کے لئے تعب و کسل اور شکستگی اعضاء کا سبب ہوتا ہے۔ حالانکہ اگر غور کی نگاہ سے دیکھا جائے تو اصل شادمانی وہ ہے جس سے نظر کو جلا، دل کو روشنی، روح کو قوت اور دل کو ناقابل زوال سرور حاصل ہو۔“⁴¹

اسی طرح مولانا نے اپنے سفر نامہ ”بنگلور میں ایک اہم سیمینار اور اس نواح کا میرا پہلا سفر“ میں میسور جاتے ہوئے قدرتی مناظر کی عکاسی انتہائی دلکش انداز میں کی، وہ کہتے ہیں کہ:

”میسور بنگلور سے اسی میل کی مسافت پر ہے۔ لیکن یہ پورا علاقہ اس درجہ حسین و دلکش ہے کہ ہر قدم پر ”چشم کو ہر رنگ میں وا“ ہو جانے کی دعوت دیتا ہے۔ سبزہ جہاں جہاں اور لالہ چمن چمن۔ ہمہ خُلم ہمہ کشمیر، یہاں اگر کمی ہے تو اس چیز کی جسے اقبال نے کہا ہے:

دختر کے برہمنے لالہ رنے سمن برے

چشم بروئے اُوکشا باز بچو بیشن نگر

اور اس میں شک نہیں کہ یہ کمی معمولی نہیں ہے کیونکہ ظرف حسین ہو اور ساتھ ہی مظروف بھی جاذبِ نظر ہو تو اس کا عالم ہی دوسرا ہوتا ہے۔ ایک جام بلورین میں سادہ پانی بھر کر رکھ دیجئے کوئی اسے آنکھ اٹھا کر دیکھے گا بھی نہیں اور اُس میں آتش سیال انڈیل دیجئے تو جگر کے بقول رنگ اڑنے لگے گا۔

دم بخود ہیں حضرت زاہد یہیں تک دیکھ کر

ہوش اڑ جاتے اگر شیشہ سے باہر دیکھتے

لیکن میری طرح جو لوگ حسن ذاتی کے قدر دان ہوتے ہیں وہ حسنِ اضافی کے بغیر بھی گزارہ کر لیتے ہیں اور غالب کی طرح انہیں یہ شکوہ نہیں ہوتا کہ:

بجلی اک کوند گئی آنکھ کے آگے تو کیا

بات کرتے کہ میں لب تشنہ تقریر بھی تھا،“⁴²

مولانا کی اس خصوصیت کا اظہار سفر نامہ ”چند روز جاپان میں“ کے اس اقتباس سے بھی ہوتا ہے۔ آپ نے وہاں کے عوام کی

حُب الوطنی، نظم و ضبط دیکھ کر نہ صرف اس کو سراہا بلکہ ہم وطنوں کو بھی اس بات کا احساس دلایا۔ آپ جاپان کے لوگوں میں نظم و ضبط کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں:

”یہاں سیر و تفریح کار میں ناممکن ہے اس لئے اس کو چھوڑ کر ہم کبھی ”وے“ میں بیٹھے اور کبھی مونوریلوے (یعنی وہ ریل جو صرف ایک پہیہ پر چلتی ہے) کہتے ہیں کہ اس کی رفتار دو سو میل فی گھنٹہ ہے اور یوں بھی جاپانی ریلوے دنیا کی سب سے زیادہ تیز رفتار ریلوے تسلیم کی گئی ہے۔ وقت کی پابندی کا یہ عالم کہ ٹائم ٹیبل میں وقت دیکھ کر گھڑی ملا لیجئے، پھر مجال ہے کہ کہیں ایک مسافر پر دوسرا مسافر گرے۔ شور و شعاع اور ہنگامہ ہو۔ کوئی چیز ٹوٹی پھوٹی یا میلی کچیلی نظر آئے۔ کسی مسافر کو آپ لیٹا ہوا یا اونگھتا ہوا نہیں پائیں گے۔ عورت مرد جوان بوڑھے اور بچے سب اپنی اپنی سیٹ پر چست بیٹھے ہوئے ہیں ان میں بے کار کوئی نہیں ہے۔ کوئی اخبار پڑھ رہا ہے، کوئی میگزین اور کتاب، عورتیں جو کتاب یا اخبار نہیں پڑھ رہی ہیں بننے کا سامان ان کے ہاتھ میں ہے اور وہ برابر حرکت میں ہے۔ دو شخص اگر بات بھی کر رہے ہیں تو آہستہ آہستہ تاکہ پاس بیٹھے ہوئے مسافروں کو ناگوار کی نہ ہو۔ معلوم نہیں سگریٹ پینا ممنوع ہے یا نہیں! بہر حال مجھے کہیں سگریٹ کا دھواں نظر نہیں آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو قومیں اپنے آپ کو بنا ناچاہتی ہیں ان کے لیے جاپان ایک منظم اور منضبط اجتماعی زندگی کی ایک روشن اور قابل تقلید مثال پیش کرتا ہے۔“⁴³

۵۔ مولانا نے جن ممالک کے سفر نامے قلمبند کئے ہیں وہاں کی تہذیب و ثقافت، اقدار و روایات اور مذہبی، علمی، سیاسی اور معاشرتی حالات کا بھی احاطہ کیا ہے۔ یہاں ذیل میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ مثلاً مولانا نے اپنے سفر نامہ ”ویارغرب کے مشاہدات و تاثرات“ (کینیڈا) میں مغربی زندگی کے اہم خدوخال جیسے لڑکے اور لڑکیوں کا آزادانہ ملنا جلنا اس کی بھی عکاسی کی ہے۔ آپ کہتے ہیں:

”عام زندگی میں ہر شخص دیکھتا ہے مرد عورت کے درمیان کوئی کسی قسم کا باریک سا پردہ بھی حائل نہیں ہے۔ دفنوں، کارخانوں، دکانوں میں، سڑکوں پر اور بسوں پر، ہر جگہ دونوں ساتھ ساتھ اور دوش بدوش، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں، تعلیم کا زمانہ آغاز شباب کا بھی ہوتا ہے اور بے پروائی کا بھی، زندگی کے اس دور میں بھی کلاسوں میں، لائبریری میں، کیفے میں، کھیل کے میدانوں میں لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے سے ہنستے بولتے، ہانہوں میں ہانہیں ڈال کر چلتے پھرتے اور کبھی کبھی بوس و کنار کرتے نظر آتے ہیں۔ ایک مشرقی نژاد کو چونکا دینے کے لئے ان میں سے ہر ایک بات کافی ہے۔ لیکن وہاں کوئی نوٹس نہیں لیتا اور آنکھ اٹھا کر بھی کوئی نہیں دیکھتا۔ نو عمر اور جوان لڑکوں اور لڑکیوں کے اس خلا کو دیکھ کر طرح طرح کے قیاسات کئے جاسکتے ہیں اور لوگ کرتے بھی ہیں لیکن میرا حسیباً ایک شخص جو وہاں ٹیچر ہو کر گیا ہو⁴⁴ اور نہایت شریف بلکہ مذہبی قسم کے لوگوں میں رہتا ہو انہی سے اُس کا واسطہ ہو اور اُس کو یونیورسٹی میں طلباء و طالبات کی زندگی کو زیادہ قریب اور بے تکلفی کے ساتھ دیکھنے کا موقع نہ ملا ہو، وہ جو کچھ اُس نے دیکھا ہے اُس سے زیادہ کیا کہہ، یا بتا سکتا ہے۔ لیکن کہنے والے کیا کچھ نہیں کہتے؟“⁴⁵

اسی طرح اپنے سفر نامہ ”چند روز ایران میں“ وہاں کے مذہبی اقدار یعنی محرم الحرام کی نویں اور دسویں تاریخ کو ماتم کی جو تقریبات منائی جاتی ہیں اس کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں:

”ایران میں سرکاری طور پر صرف دو دن یعنی ۹ اور ۱۰ محرم کی تعطیل ہوتی ہے۔ چنانچہ کل کی طرح آج بھی چھٹی ہے۔ تمام دفاتر، کارخانے، بازار، تعلیمی ادارے بند ہیں۔ مکانوں اور دکانوں پر جگہ جگہ سیاہ جھنڈیاں لہرا رہی ہیں اور کپڑوں پر ”یا حسین“ یا شہادت سے متعلق کوئی اور عبارت فارسی یا عربی میں لکھی ہوئی ہے۔ اس روز مشہد میں ماتم کی تقریب کس طرح منائی جاتی ہے اور اس میں کیا کیا ہوتا ہے؟ ہم کو یہ سب کچھ دکھانے کا خاص انتظام کیا گیا تھا۔ چنانچہ صبح ۹ بجے کے قریب وائس چانسلر اور بعض اساتذہ ہوٹل تشریف لائے اور ہم کو ساتھ لے کر آستانِ قدس پہنچے۔ یہاں بالائی منزل کی ایک شہ نشیں میں جہاں سے آستانِ قدس کے نہایت وسیع صحن کا پورا منظر نظر آتا تھا۔ ہم سب کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ہم نے دیکھا کہ سینکڑوں انسانوں کی ٹولیاں مختلف محلوں اور جماعتوں کی طرف سے سیاہ لباس میں ملبوس ماتم کرتی، سینہ کو بی اور مرثیہ خوانی کرتی ہوئی ایک معین دروازہ سے صحن میں داخل ہوتی اور آخر وضہ مبارک پر پہنچ کر منتشر ہو جاتی تھیں۔ بہت سے لوگوں کے ہاتھوں میں لوہے کی زنجیریں بھی تھیں۔ میں نے لہو لہان ہوتے تو کسی کو نہیں دیکھا لیکن زنجیریں اس زور سے مارتے کہ جسم کا بالائی حصہ سُرخ ہو جاتا تھا۔ ہر ٹولی میں کچھ ایسے بھی ہوتے تھے جو وضہ تک پہنچتے پہنچتے بے ہوش ہو کر گر پڑتے تھے۔ ان لوگوں کے لئے حکومت کی طرف سے جگہ جگہ سپاہی متعین تھے جو فوراً ان کو اٹھا کر ایک طرف کر دیتے اور ان کو ضروری طبی مدد پہنچاتے تھے۔ ہم یہاں تین ساڑھے تین گھنٹے بیٹھے ہوں گے۔ لیکن ہم نے دیکھا کہ ماتم گساروں کا تانتا ایک سیکنڈ کے لئے نہیں ٹوٹتا۔ یہ سب جوان عمر تھے۔ خال خال کم عمر بچے بھی نظر آتے تھے۔ البتہ کوئی عورت یا عمر رسیدہ شخص ان ٹولیوں میں شریک نہیں تھا۔ ہندوستان میں ہم لوگ ان دنوں میں تعزیہ داری، تعزیہ برداری اور علم وغیرہ دیکھنے کے عادی ہیں۔ نگاہ ان چیزوں کو یہاں بھی ڈھونڈتی رہی۔ بلکہ غالب خیال تھا کہ یہ چیزیں یہاں زیادہ شاندار اور شوکت و طمطراق کے ساتھ ہوں گی۔ لیکن معلوم ہوا کہ علم کا جلوس اور تعزیہ قسم کی کوئی چیز ایران میں کبھی نہیں ہوئی، یہ صرف ہمارے ملک کی ایجاد ہے اور اسی میں محدود ہے۔“⁴⁶

اسی سفر نامے میں مولانا نے ایران کے شہر نیشاپور کو دیکھ کر وہاں کی تہذیب اور اس کی روایات بالخصوص عورتوں میں پردے کی پابندی کو بھی بیان کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں: ”نیشاپور میں اب تک قدامتِ جدت پر غالب ہے۔ نئے طرز کی عمارتیں اگرچہ کہیں کہیں نظر آتی ہیں۔ لیکن اکثریت پرانے وضع کے مکانوں کی ہے۔ مردوں اور عورتوں کا لباس بھی عموماً ان کا اپنا قومی لباس ہے۔ عورتیں جب باہر نکلتی ہیں تو ایک بڑی لانی سی چادر جو عموماً سیاہ ہوتی ہے سر سے پیر تک اس سے اپنا بدن چھپا لیتی ہیں۔ یہ گویا ان کا برقعہ ہے۔ صرف آنکھیں اور چہرے کا ایک حصہ کھلا رہتا ہے۔ جو عورتیں اسکرٹ استعمال کرتی ہیں وہ بھی دبیز قسم کے موزوں سے اپنی ٹانگیں چھپائے رہتی ہیں اور ان کے سر پر ایک بڑا رومال ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ رضا شاہ پہلوی پر چونکہ مغرب پرستی کا جنون سوار تھا اس لئے اس نے پردہ کو قانوناً ممنوع قرار دیا اور اس میں اس حد تک آگے بڑھ گیا کہ سپاہیوں کو حکم دیا کہ اگر کسی مکان میں کوئی عورت چادر اوڑھ کر نماز پڑھتی ہوئی بھی نظر آئے تو اس کی چادر پکڑ کر کھینچ لی جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پردہ بالکل غائب ہو گیا۔ لیکن جب موجودہ شہنشاہ آریہ مہر سریر آرائے حکومت ہوئے تو چونکہ یہ خود مذہبی آدمی ہیں اور طبیعت میں بڑا اعتدال و توازن ہے اس لئے انہوں نے دوسری اصلاحات کے ساتھ یہ بھی کیا کہ بے پردگی کے حکم کو منسوخ کر کے ہر عورت کو آزادی دی کہ وہ چاہے تو پردہ کرے اور نہ چاہے تو نہ کرے۔ ایرانی احباب نے بتایا کہ اس فرمانِ شہانی کا شائع ہونا تو نوے فیصد عورتیں اپنے قدیم وضع کے مطابق پردہ کرنے لگیں یہ قدیم وضع کا پردہ تہران جیسے شہروں میں خال خال نظر آتا

ہے۔ لیکن نیشاپور جیسے الگ تھلگ اور پرانی وضع کے شہروں میں عام ہے۔“⁴⁷

مولانا کی اس خصوصیت کا اندازہ سفر نامہ ”دیوارِ غرب کے مشاہدات و تاثرات“ سے بھی ہوتا ہے۔ آپ نے کینیڈا میں یونیورسٹی کے نظامِ تعلیم کا بھی مشاہدہ کیا اور اپنے سفر نامے میں اس طرح بیان کیا:

”وہاں (کینیڈا) کے نظامِ تعلیم میں سیمینار کی حیثیت بعض اعتبارات سے لیکچر سے بھی زیادہ ہے۔ جو طلباء اس میں عملاً حصہ زیادہ لیتے ہیں اور جو بات کہتے ہیں معقول طریقے پر کہتے ہیں، اُن کا ریکارڈ بننا ہوتا ہے اور امتحان کے موقع پر اُن کو زیادہ اچھے نمبر ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بھی کہا جاتا تھا کہ آئندہ ہفتہ میں سیمینار جس موضوع پر ہو گا اُس کے متعلق چند سوالات لکھ کر اور اُن کو ٹائپ کر کے آج کے ہی دن تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ ان سوالات کی روشنی میں شرکائے سیمینار ایک ہفتے تک موضوعِ بحث کا مطالعہ کر کے اُس کے متعلق نوٹ تیار کر سکیں۔ یہ سوالات اسمتھ صاحب⁴⁸ اور میں دونوں مل کر تیار کرتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ تنہا وہ یا میں سوالات بناتے تھے۔ یہ سیمینار بڑی باقاعدگی و باضابطگی مگر بے تکلفی کے ساتھ ہوتا تھا، کوئی طالب علم ہو یا استاد، درمیان میں ہی جب چاہتا تھا سگریٹ یا پائپ پینا شروع کر دیتا تھا۔ یونیورسٹی کے نظامِ تعلیم کے ماتحت ایم۔ اے کے ہر طالب علم کو ہر مضمون میں ایک ٹرم پیپر (Term paper) لکھنا ہوتا ہے۔ اگر مضمون دو ٹرم کا ہے تو دو مقالے لکھنے ہوں گے۔ چنانچہ ان دونوں سیمیناروں کے طلباء و طالبات سے دریافت کر کے موضوعِ بحث کے متعلق ایک عنوان اُن کو دے دیا گیا۔ اب یہ پورے ٹرم میں اس پر مطالعہ کریں گے اور ایک مقالہ لکھ کر پیش کریں گے، یہ مقالہ کہنے کو ایم۔ اے کا ہوتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ مواد و معلومات اُن کی ترتیب اور بحث و تنقید کے اعتبار سے ہمارے ہاں کے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے سے کم و قیچ نہیں ہوتا۔ یہ مقالہ بھی سیمینار میں پیش کیا جاتا اور موضوعِ بحث و گفتگو ہوتا ہے۔ چونکہ ایم۔ اے کے ہر مضمون سے متعلق ایک ٹرم میں ایک مقالہ اس طرح کا ہر طالب علم کو لکھ کر پیش کرنا ضروری ہوتا ہے اس لئے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ وہاں کے ایم۔ اے کا معیار کتنا اونچا ہے اور ایک طالب علم کو اُس میں کامیاب ہونے کے لئے ہر مضمون سے متعلق کس قدر وسیع مطالعہ کرنا ہوتا ہے۔“⁴⁹

۶۔ مولانا کے سفر ناموں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے سفر ناموں میں مجالس، استقبالیہ، مجالس کا احوال اور ملاقاتوں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ مثلاً مولانا اکبر آبادی اپنے سفر نامہ ”دیوارِ غرب کے مشاہدات و تاثرات“ میں پروفیسر و لفریڈ کنٹول اسمتھ سے اپنی ملاقات کا احوال ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں: ”۱۹۵۱ء کا جبکہ میں کلکتہ میں تھا ذکر ہے، ایک دن صبح کے وقت میں اپنے آفس میں بیٹھا ہوا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، رسیور اُٹھایا تو آواز آئی کہ میں و لفریڈ کنٹول اسمتھ ہوں۔ کل کلکتہ آیا ہوں اور یہاں گرانڈ ہوٹل میں مقیم ہوں۔ آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ جس وقت آپ کہیں حاضر ہو جاؤں۔ میں نے موصوف کی کتاب ”اسلام ان ماڈرن انڈیا“ پڑھ رکھی تھی اسی لئے اُن سے خوب واقف تھا، میں نے جواب دیا ”ابھی میرے دفتر میں تشریف لے آئیے مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوگی۔“ انہوں نے شکر یہ ادا کیا اور گفتگو ختم ہو گئی۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد پروفیسر اسمتھ پہنچ گئے، یہ میری اُن سے پہلی ملاقات تھی۔ رسمی طور پر دونوں طرف سے مزاج پُرسی کے بعد موصوف نے خالص علمی گفتگو شروع کر دی۔ جس کا موضوع کچھ اسلام اور زیادہ تر اقبال کی شاعری اور فلسفہ تھا۔ اس سلسلے میں، میں نے جو کچھ کہا پروفیسر اسمتھ اُس کے بعض بعض فقرے اپنی نوٹ بک میں لکھتے رہے۔ چونکہ یہ میرے

دفتر کا وقت تھا اور خود معزز مہمان کو بھی اس کا احساس تھا اس لئے گفتگو زیادہ دیر تک جاری نہیں رہ سکی، جب رخصت ہونے لگے تو دوسرے دن انہوں نے مجھ کو طعام شب پر ہوٹل میں مدعو کیا۔ جسے میں نے بڑی خوشی سے منظور کر لیا۔ دوسرے دن حسب وعدہ میں مقررہ وقت پر پہنچا اور ہم دونوں کھانے کی میز پر بیٹھے تو سب سے بڑا تاثر پروفیسر اسمتھ کی شخصیت کے متعلق مجھ کو اس واقعہ سے ہوا کہ انگریزی ہوٹلوں کے عام قاعدے کے مطابق کھانا لانے سے پہلے ویٹر نے جب پوچھا کہ میں شراب (drink) کو نسی لاؤں؟ تو اسمتھ صاحب نے صاف انکار کر دیا اور پھلوں کا عرق لانے کا آرڈر دیا۔ میں نے خیال کیا کہ میری وجہ سے ایسا کر رہے ہیں اس لئے میں بولا ”آپ جو پیتے ہیں وہ پیچھے، اُس میں تکلف کی ضرورت نہیں۔ میں فروٹ جو س پی لوں گا۔“ اس کے جواب میں انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا ”شراب اور سگریٹ کو آج تک ایک مرتبہ بھی میں نے منہ نہیں لگایا ہے۔“ مجھ کو اس پر تعجب ہوا اور میں نے اس سلسلہ میں مزید سوالات کئے تو معلوم ہوا کہ صرف یہی نہیں بلکہ بعض چیزیں جو مغربی زندگی کے نمایاں خدوخال سمجھی جاتی ہیں موصوف کا دامن اُن سے بھی کبھی آلودہ نہیں ہوا۔ میں پروفیسر اسمتھ کی علمی قابلیت اور ذوقِ تحقیق کا تو پہلے سے قائل تھا ہی اس واقعہ نے اُن کے اخلاق اور کردار کا بھی دل پر نقش جمادیا۔ جو آٹھ مہینہ مسلسل اُن کے ساتھ رہنے اور ان کو بہت قریب سے جلوت میں اور خلوت میں دیکھنے سے اور گہرا ہو گیا۔ پھلوں کے عرق کا ایک ایک گلاس پینے کے بعد کھانا شروع ہوا تو کھانے پر اور اس سے فراغت کے بعد ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ہم دونوں میں دیر تک مفصل گفتگو ہوئی اور اس سب کا موضوع ”اسلام اور عالم اسلام کی مختلف تحریکات“ تھا۔ اسی سلسلہ میں موصوف نے بتایا کہ حال میں ہی مک گل یونیورسٹی مونٹریل (کینیڈا) میں اسلامی علوم و فنون کا ایک انسٹی ٹیوٹ قائم ہوا ہے اور وہ اس کے ڈائریکٹر ہیں۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ کیا میں سال دو سال کے لئے وہاں آنا پسند کروں گا، جب میں نے جواب اثبات میں دیا تو انہوں نے زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ شکر گزاری کا اظہار کیا اور اب مجلس برخواست ہو گئی۔“⁵⁰

اسی طرح مولانا نے اپنے سفر نامہ ”بنگلور میں ایک اہم سیمینار اور اس نواح کا میرا پہلا سفر“ میں میسور میں اپنے دورانِ قیام

ایک علمی مجلس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

”ہم لوگ میسور میں عزیز سیٹھ کے مکان پر آئے۔ موصوف اس علاقے کے دیرینہ اور بلند مرتبہ قومی کارکن ہیں اور ایم۔ ایل۔ اے بھی ہیں۔ یوسف شریف صاحب نے پہلے سے ان کو میرے میسور پہنچنے کی اطلاع کر دی تھی اور انہوں نے طعام شب کا اہتمام کرنے کے ساتھ میسور کے چند ذی علم حضرات کو مجھ سے ملنے اور گفتگو کرنے کے لئے مدعو کر لیا تھا۔ چنانچہ نو سو انوبجے کے قریب عزیز سیٹھ صاحب کے مکان پر ہم لوگ کھانے سے فارغ ہو کر بیٹھے ہی تھے کہ متعدد حضرات تشریف لے آئے۔ ان میں صرف محب مکرّم جناب مبارز الدین رفعت صاحب شعبہ اُردو مہارانی کالج سے بواسطہ بُہان غائبانہ تعارف تھا اب اُن سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا۔ ان کے علاوہ جن حضرات کے نام یاد رہ گئے ہیں وہ یہ ہیں (۱) جناب علی جان صاحب شعبہ عربی مہارانی کالج (۲) جناب سلیم تمنائی صاحب مشہور افسانہ نگار (۳) جناب یوسف سیٹھ صاحب شعبہ انگریزی فلو منا کالج (۴) جناب ہیڈ ماسٹر صاحب فاروقیہ ہائی اسکول۔ ان کے علاوہ جو اور حضرات تھے اور وہ غالباً طبقہ تجار سے اور اسلامی و تبلیغی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ سخت افسوس ہے کہ ان کے نام یاد نہیں رہے۔“ معذرت خواہ ہوں، بہر حال بڑا سنجیدہ، مہذب اور شائستہ مجمع تھا۔ اب گفتگو شروع ہوئی اور موضوع وہی مسلمانوں کے مسائل و

معاملات۔ تو ساڑھے دس بج گئے، بولنا زیادہ مجھے ہی پڑا۔ پورا دن اسی طرح ایک منٹ کے لئے کمر سیدھی کئے بغیر نقل و حرکت میں گزر گیا تھا اور ابھی بنگلور واپس ہونا بھی تھا۔ اس لئے میں نے بادل خواستہ ان حضرات سے اجازت لی اور اب ہم میسور کی گل ریز و عطریہ فضاؤں اور ہواؤں کو الوداع کہتے ہوئے واپس روانہ ہو گئے۔“⁵¹

اسی طرح مولانا اکبر آبادی نے صدر پاکستان ضیاء الحق کی طرف سے استقبالیہ کا احوال اپنے سفر نامہ ”پاکستان، جنوبی افریقہ اور

پھر پاکستان“ میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

”دوسرے دن یعنی ۸ مارچ کو پروگرام کے مطابق صدر مملکت کی طرف سے مندوبین کاڈز تھا اور اس کے لئے دعوتی کارڈ تقسیم ہو بھی چکے تھے۔ لیکن وہ وقت کے وقت (کسی وجہ سے) منسوخ ہو گیا۔ پروگرام میں اس ناگہانی تبدیلی کے باعث صدر ضیاء الحق سے ۸ مارچ کو متوقع ملاقات نہ ہو سکی۔ البتہ ایک اور صورت یہ پیدا ہوئی کہ ۱۰ مارچ کو یعنی جس دن کانفرنس ختم ہو رہی تھی مغرب کے بعد صدر کی طرف سے ہم لوگوں کا استقبالیہ تھا۔ میں نے دیکھا تو نہیں مگر سنا ہے کہ سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے ایک کروڑ کی لاگت سے نہایت عالیشان قصر صدارت تعمیر کرایا تھا۔ جنرل ضیاء الحق اب صدر پاکستان ہیں اور انہیں حق ہے کہ اس قصر میں رہیں، لیکن وہ حسب سابق اب تک راولپنڈی میں کمانڈران چیف کی رہائش گاہ میں رہتے ہیں۔ چنانچہ یہ استقبالیہ وہیں ہوا، مغرب کے بعد ہوٹل سے مندوبین کا کارواں روانہ ہوا، صاف و شفاف، وسیع و کشادہ سڑکیں، ان کے ارد گرد درختوں کی قطاریں، خاموش ماحول، مترنم فضا، ہلکی چاندنی کی سفید شال میں لپٹی ہوئی۔ اس میں شاندار امریکن کاروں کا دوش بدوش اور آگے پیچھے برق رفتاری کے ساتھ دوڑنا ایک عجب رومانی منظر پیدا کر رہا تھا جس سے میں کافی متاثر ہوا، راستے میں وہ جمیل خانہ بھی پڑتا ہے جس میں بھٹو قید رہے اور پھر تختہ دار پر چڑھادیئے گئے۔ اس پر نظر پڑی تو بے ساختہ زبان سے نکلا:

وَعُدُّ مَن نَّكَأَهُ وَتَذِلُّ مَن نَّكَأَهُ طَيْبِيكَ الْخَيْرُ

”اے خدا تو جس کو چاہتا ہے عزت اور جس کو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے اور سب بھلائیاں تیرے ہاتھ میں ہیں۔“

منزل مقصود پر پہنچنے کے بعد ہم سب مندوبین ایک بڑے ہال میں دائرہ کی شکل میں بٹھادیئے گئے ہر ملک کے ڈیلی گیٹیشن کو الگ الگ ملنا تھا۔ بیٹھے ہوئے ہم کو تھوڑا ہی وقفہ ہوا تھا کہ ایک شخص نے کہا: انڈیا کے ڈیلی گیٹیشن کو بلاتے ہیں۔ ہم ہال سے نکلے تو ایک چھوٹے کمرے میں داخل ہوئے اس کمرے کے وسط میں صدر ضیاء الحق تبسم بلب نہایت عمدہ کٹ کی شیروانی اور شلوار میں ملبوس کھڑے تھے۔ ہم لوگ اندر داخل ہوئے۔ علیک سلیک کے بعد مصافحہ کیا اور کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سید صباح الدین عبدالرحمن، سید اوصاف علی اور ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے خاموشی کے برف کو توڑنے کی غرض سے دوچار جملے کہے، صدر صاحب مسکراہٹ کے ساتھ انہیں اس طرح سنتے رہے کہ گویا ان سے محفوظ ہو رہے ہیں۔ میں حسب عادت بالکل خاموش رہا۔ چند منٹ کے بعد ہم رخصت ہوئے تو میں سب سے پیچھے تھا۔ میں نے الوداعی سلام اور مصافحہ کیا تو صدر ضیاء الحق نے مجھ کو روک لیا۔ مسٹر اے۔ کے۔ بروہی (سکرٹری) بھی اس وقت وہاں کھڑے تھے۔ اب ہم دونوں میں یہ گفتگو ہوئی:

ض: میری تو خواہش تھی کہ کانفرنس کے ختم ہونے کے بعد آپ دو چار دن اور یہاں قیام کرتے اور میرے مہمان رہتے۔

س: شکریہ! مگر میرا ریزرویشن ہو گیا ہے، کل صبح روانہ ہو جاؤں گا۔

ض: آپ کا پروگرام کیا ہے؟ کہاں کہاں جائیے گا؟

س: یوں تو پاکستان میں ہر جگہ میرے اعزہ واقرباء موجود ہیں لیکن میری ایک بیٹی ریحانہ جو پروفیسر محمد اسلم (پنجاب یونیورسٹی) کی اہلیہ ہے، لاہور میں ہے اور دوسری بیٹی مسعودہ اور ایک بیٹا جنید احمد کراچی میں ہیں اس لئے پہلے لاہور جاؤں گا اور پھر کراچی، وطن واپسی بہر حال لاہور سے ہوگی۔

ض: اچھا! تو پھر ایسا کیجئے کہ واپسی پر میرے پاس چند روز قیام کیجئے۔

س: بہت بہتر! شکریہ

ض: (اپنے سکریٹری کی طرف اشارہ کر کے) آپ ان کو اپنا لاہور اور کراچی کا ایڈریس دے دیں اور یہاں کاپتہ اور ٹیلیفون نمبر لکھ لیں۔ میں نے انڈین ڈیلی گیٹیشن کی طرف سے صدر پاکستان کا ان کی نہایت فیاضانہ میزبانی اور خصوصی الطاف و عنایات پر شکریہ ادا کیا اور رخصت ہونے لگا تو فرمایا! ”آپ لاہور اور کراچی میں اپنی بیٹیوں کو دعا کیجئے اور یہ کہہ دیجئے کہ جب کبھی انہیں کوئی ضرورت ہو، بے تکلف یاد کر لیں۔“ میں نے اس کا مزید شکریہ ادا کیا اور ایک گوشہ میں جا کر سکریٹری کو اپنا لاہور اور کراچی کا ایڈریس نوٹ کرایا اور خود یہاں کا ایڈریس اور فون نمبر نوٹ کیا۔ اب میں پھر واپس لوٹا اور صدر صاحب اور مسٹر اے۔ کے۔ بروہی کو الوداعی سلام کر کے روانہ ہونے لگا تو صدر پاکستان نے ازراہ لطف و کرم خاص اپنے اُس آخری جملہ کو پھر دہرایا، یعنی: اپنی بیٹیوں سے کہہ دیجئے..... ”اس وقت میں نے دیکھا کہ بروہی صاحب جو خود اعلیٰ صفات و اخلاق کے بزرگ ہیں ان کے چہرہ پر ایک خاص قسم کی چمک اور لبوں پر مسکراہٹ طاری ہو گئی۔ غالباً اس کا سبب ان کا یہ احساس تھا کہ اللہ کے فضل و کرم سے ان کا صدر پاکستان کس درجہ شریف النفس اور کریم الطبع ہے کہ ایک انڈین جس سے کبھی دو حرف پڑھے تھے۔⁵² اس کے ساتھ اس درجہ شفقت اور التفات و توجہ کا معاملہ کر رہا ہے۔ یہ ہماری اسلامی اور مشرقی تہذیب کی وہ قدریں ہیں جن کا دامن برصغیر کی نئی نسلوں کے ہاتھوں تار تار ہو رہا ہے اور ہماری یونیورسٹیاں اور تعلیم گاہیں، وہ اعلیٰ گزٹھ میں ہوں یا کراچی میں، آئے دن ہنگاموں اور فتنہ و فساد کی آماج گاہ بنتی جا رہی ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ خود میں بھی اس قدر متاثر ہوا کہ غالب کا یہ شعر میرے حسبِ حال تھا!

میں اور حظّ و صل! خدا ساز بات ہے

جان نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

صدر ضیاء الحق اور بروہی صاحب نے خدا حافظ کہا اور میں باہر آ کر اسی ہال میں بیٹھ گیا۔ یہاں چائے اور کافی کا دور چل رہا تھا، اس

میں شریک ہوا۔“⁵³

مولانا اکبر آبادی کے سفر ناموں کے اجمالی مطالعے کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ سفر نامے معلومات کا ذخیرہ اور زبان و ادب کا گراں بہا سرمایہ ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان میں ہدایت و رہنمائی کا سامان بھی ہے۔ اس بات کا بھی تذکرہ کرتے چلیں کہ مولانا کے مذکورہ سفر ناموں کو اب تک مرتب و مدون کیا گیا ہے اور نہ ہی موضوع مطالعہ و تحقیق بنایا گیا ہے۔ لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ان سفر ناموں کو نہ صرف مرتب و مدون کیا جائے بلکہ اس کے علمی و ادبی حیثیت کے تعین کا اہتمام بھی کیا جائے۔

حواشی و حوالہ جات

1۔ آپ کی مستقل تصانیف میں الرق فی الاسلام (اسلام میں غلامی کی حقیقت)، غلامان اسلام، صدیق اکبر، عثمان ذوالنورین، مسلمانوں کا عروج و زوال، وحی الہی، فہم قرآن شامل ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کی تصانیف میں مضامین و مقالات کے وہ مجموعے بھی شامل ہیں جو پہلے برہان میں شائع ہوئے پھر ان کی اہمیت کے پیش نظر اسے کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔ ان میں مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے ناقد، چار علمی مقالات، نقشۃ المصدور اور ہندوستان کی شرعی حیثیت، مولانا ابوالکلام آزاد۔ سیرت و شخصیت اور علمی و عملی کارنامے، خطبات اقبال پر ایک نظر، علمائے ہند کا سیاسی موقف، اور عہد نبوی کے غزوات و سرایا اور ان کے ماخذ پر ایک نظر (یہ طویل مقالہ ۱۹ قسطوں میں برہان سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کو مرتب کرنے کی سعادت راقمہ کو حاصل ہوئی ہے)۔

2۔ ۱۹۳۸ء میں ندوۃ المصنفین (دہلی) کا قیام عمل میں آیا۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مفتی عتیق الرحمن عثمانی، مولانا حافظ الرحمن، سیوہاروی اس کے بانی رکن قرار پائے۔ ندوۃ المصنفین دہلی نے مسلمانوں کی علمی و سیاسی رہنمائی کے لیے اپنا ایک ماہنامہ ”برہان“ نامی رسالہ جاری کیا تو اس کی ادارت کے فرائض مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے انجام دیئے۔ مرتب و مدیر کی حیثیت سے مولانا اکبر آبادی نے رسالہ برہان کی پیدائش کے روز اول سے اپنی وفات تک اس کے ادارے ”نظرات“ کے عنوان سے لکھے۔ اس طرح آپ کی برہان کی ادارت کے فرائض کی مدت ۴ سالوں پر محیط ہے اور یہاں یہ کہنا حق بجانب ہے کہ مولانا کی زندگی کے ساتھ ہی ”برہان“ کا چراغ بھی گل ہو گیا۔ عاصم، عبید اقبال، نظرات کا طویل اداری سلسلہ النباء العظیم مشمولہ: مولانا سعید احمد اکبر آبادی احوال و آثار، (مرتبہ) محمد سعود عالم قاسمی، علی گڑھ: مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، شعبہ سنی دینیات، ۲۰۰۵ء، ص ۱۹۵۔

3۔ مہدی، جمیل، نظرات، مشمولہ: برہان، ندوۃ المصنفین، دہلی، جون ۱۹۸۵ء، جلد ۹۵، شمارہ ۶، ص ۳۔

4۔ یہ مولانا اکبر آبادی کا پہلا سفر نامہ ہے جو برہان کے شمارے جولائی ۱۹۳۹ء میں ایک قسط میں شائع ہوا۔

5۔ اس سفر نامہ کی روداد ایک قسط میں مولانا نے جولائی ۱۹۵۸ء کے برہان کے شمارے میں شائع کی۔

6۔ ۱۲ قسطوں پر مشتمل یہ سفر نامہ ستمبر ۱۹۶۳ء سے برہان میں شائع ہونا شروع ہوا۔

7۔ اس کا نفرنس کا احوال برہان، اپریل ۱۹۶۳ء کے شمارے میں شائع ہوا۔

8۔ برہان میں اس کا نفرنس کی روداد اپریل ۱۹۶۵ء کے شمارے میں چھپی۔

9۔ اس کا نفرنس کی روداد اگست ۱۹۶۵ء برہان کے شمارے میں شائع ہوئی۔

10۔ اس کا نفرنس کا احوال مولانا نے جنوری ۱۹۶۷ء کے برہان کے شمارے میں شائع کیا۔

11۔ یہ سفر نامہ ایک قسط پر مشتمل اکتوبر ۱۹۶۷ء میں برہان میں شائع ہوا۔

12۔ اس سیمینار کا احوال بھی مولانا نے جنوری ۱۹۶۸ء میں برہان میں شائع کیا۔

13۔ یہ سفر نامہ جولائی ۱۹۷۰ء سے ۹ قسطوں میں برہان میں شائع ہوا۔

14۔ اپریل ۱۹۷۱ء سے ۶ قسطوں میں برہان سے شائع ہوا۔

15۔ یہ سفر نامہ دو قسطوں پر مشتمل ہے، برہان۔ اکتوبر، نومبر ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا۔

16۔ مئی ۱۹۷۳ء سے آٹھ قسطوں میں برہان سے شائع ہوا۔

17۔ یہ سفر نامہ بھی جولائی ۱۹۷۷ء سے چھ قسطوں میں برہان میں شائع ہوا۔

18۔ اس سفر کی روداد برہان کے مئی ۱۹۷۹ء کے شمارے میں ایک قسط میں شائع کی۔

19۔ یہ سفر نامہ چار قسطوں میں جنوری ۱۹۸۱ء سے برہان میں شائع ہوا۔

20۔ چار قسطوں پر مشتمل اس سفر نامہ کی روداد مولانا اکبر آبادی نے دسمبر ۱۹۸۱ء میں برہان میں شائع کی۔

21۔ اکبر آبادی، سعید احمد، چند روزہ نعتیہ سال میں، مشمولہ: برہان، ندوۃ المصنفین، دہلی، جولائی ۱۹۳۹ء، جلد سوم، شمارہ ۱، ص ۵۵-۵۶۔

- 22- اس کے لئے ملاحظہ کیجئے: مولانا اکبر آبادی کا سفر نامہ، دیارِ غرب کے مشاہدات و تراثرات، مشمولہ: برہان، ندوۃ المصنفین، دہلی، نومبر 1963ء، جلد 53، شماره 5، ص 303-312، جنوری 1965ء، جلد 53، شماره 1، ص 38-39، فروری 1965ء، جلد 53، شماره 2، ص 116-125۔
- 23- اکبر آبادی، سعید احمد، قاہرہ میں پہلی اسلامی کانگریس، مشمولہ: برہان، دہلی ندوۃ المصنفین، اپریل 1963ء، جلد 53، شماره 3، ص 231۔
- 24- ایضاً، بنگلور میں ایک اہم سیمینار اور اس نواح کا میرا پہلا سفر، مشمولہ: برہان، دہلی ندوۃ المصنفین، اکتوبر 1962ء، جلد 59، شماره 3، ص 232۔
- 25- جن میں پروفیسر واٹ منگرمی (انگلینڈ) پروفیسر مایرون اسمتھ (امریکہ) پروفیسر میکائیل زندا (اسکو) شامل تھے۔ ایضاً، ایران میں چند روز، مشمولہ: برہان، ندوۃ المصنفین، دہلی، اگست 1960ء، جلد 65، شماره 2، ص 133۔
- 26- مولانا سعید احمد اکبر آبادی، خلیفہ ہارون الرشید کی وفات اور تند فتنوں کا واقعہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ 193ھ، میں خراسان میں بغاوت ہو گئی ہارون اس کو فرو کرنے کی غرض سے خود خراسان پہنچا اور طوس میں پڑاؤ ڈالا، یہاں سخت بیمار ہو گیا۔ حمید بن قحطبہ الطائی جو دولت بنی عباس کا نامور امیر العسا کر تھا اور جو اولاً مہدی اور پھر منصور کے عہدِ خلافت میں خراسان کا گورنر بھی رہ چکا تھا اس نے طوس میں ایک نہایت وسیع باغ خرید اور اس میں ایک عالی شان محل بھی تعمیر کرایا تھا۔ ہارون بیمار ہوا تو علاج معالجہ اور سیر و تفریح کی غرض سے اسی محل میں منتقل ہو گیا، لیکن عمر نے وفات کی اور انتقال کے بعد اسی محل میں سپرد خاک کیا گیا، اللہ اکبر! کیا عبرت سماں اور حقیقت و مجاز کے فرق کا کیسا واضح نشان ہے کہ ایک ہی مقبرہ میں ایک طرف ایک درویش (امام علی بن موسیٰ الرضا جن کو مامون نے اپنے والد بزرگوار ہارون الرشید کے پہلو میں دفن کرنے کا حکم دیا تھا) کی اقلیم و دہسیم کی زرنگار قبر ہے جو لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کی جبین عقیدت و ارادت کی سجدہ گاہ ہے اور جس پر درود و سلام کے نذرانوں کا کوئی شمار نہیں ہو سکتا۔ اور دوسری جانب ایک سادہ سی بے نقش و رنگ قبر اپنے عہد کے اس عظیم و جلیل صاحب تخت و کلاہ بادشاہ کی ہے جس کی سطوت و شوکت اور عظمت و دبہ کے آواز سے عالم گونجتا تھا لیکن آج یہ قبر سرتاسر ایک حیرت کا نشان ہے اور اس کے اندر سے آواز آرہی ہے۔

برمزا را باغریاں نے چراغ و نئے گلے

نے پیر پر واند سوزونے صدائے بلبلے

- چنانچہ میں مقبرہ میں کئی مرتبہ گیا اور یہ پتہ ہی نہ چلا کہ ہارون الرشید کی قبر کونسی ہے اور کدھر ہے اور اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ جب کبھی گیا تو مقبرہ میں ہجوم اس قدر زیادہ ہوتا تھا کہ اندر داخل ہونا مشکل تھا اور اندر داخل ہو گئے تو اب باہر نکلنا دشوار تھا۔ اسی ریل تیل اور آدھا پانی میں اتنا ہوش ہی کہاں رہتا تھا کہ کوئی اور قبر تلاش کی جاتی۔ کچھ دنوں کے بعد میں نے ایک شیعہ عالم سے دریافت کیا تو انھوں نے بڑی بے اعتنائی سے جواب دیا، ارے! آپ نے قبر دیکھی نہیں وہیں تو ایک کونہ میں ہے، بھولے بسے اگر کوئی اس پر فاتحہ پڑھنے لگتا ہے تو لوگ منع کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ”آگے بڑھو“ ایضاً، ستمبر 1960ء، جلد 65، شماره 3، ص 198-199۔
- 27- ایضاً فروری 1961ء، جلد 66، شماره 2، ص 130-132۔

29- ایضاً ص 133۔

28- ایضاً چند روز جاپان میں، مشمولہ: برہان، ندوۃ المصنفین، دہلی، فروری 1962ء، جلد 68، شماره 2، ص 129۔

- 30- مولانا کہتے ہیں کہ میسور کو بانغوں کا شہر کہا جاتا ہے اور واقعی ہے بھی ایسا ہی۔ ایک گھنٹہ سے کچھ کم میں سلطان ٹیپو شہید کا مقبرہ آ گیا۔ دروازہ میں داخل ہوتے ہی ایسا محسوس ہوا کہ بڑی عمدہ اور موثر قوائی ہو رہی ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اقبال نے سلطان شہید کی منقبت میں جو اشعار کہے ہیں، تو ان کی زبان سے ان کو ریکارڈ کر لیا گیا ہے۔ اور یہ ریکارڈ روزانہ عصر و مغرب کے درمیان میں مقبرہ کی چھت پر سے مسلسل سنائے جاتے ہیں۔ اقبال کے اشعار اور قوالوں کی زبان سے انھوں نے فضا میں عجیب کیف و سرور کا عالم پیدا کر دیا تھا۔ ایک گنبد کے نیچے سلطان ٹیپو شہید، ان کے والد اور والدہ تینوں کی قبریں برابر ہیں اور باہر سلطان کے بھائیوں، بہنوں، بیٹیوں اور بیٹوں اور دوسرے اعز و اقربا کی قبریں مقبرہ سے باہر چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں ہم نے گھوم پھر کر سب پر فاتحہ پڑھی، سلطان کی قبر پر فاتحہ پڑھتے وقت قلب و ذہن کی عجیب حالت ہوئی جسے محسوس تو کیا جا سکتا ہے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ میسور میں دو دن، مشمولہ: برہان، دہلی، ندوۃ المصنفین، مئی 1969ء، جلد 82، شماره 5، ص 308۔

- 31- مولانا اکبر آبادی کہتے ہیں کہ ”کلکتہ کی ایٹھیا تک سوسائٹی کی طرح وہاں کی ایران سوسائٹی بھی ایک اہم اور عظیم الشان علمی انجمن ہے۔ ڈاکٹر محمد اسحاق صاحب مرحوم کلکتہ یونیورسٹی میں فارسی کے استاد اور فارسی زبان و ادب کے نامور محقق اور مصنف تھے، ان کو اس زبان اور اس کی ادبیات کے ساتھ محبت نہیں، عشق تھا۔ انہوں نے اس زبان کی ترویج و اشاعت اور ایران کے علوم و فنون پر تحقیقی کاموں اور ان کے ذریعے ہندوستان اور ایران میں روابط و یگانگت و مودت کے حفظ و بقا اور ترقی کی غرض سے 1923ء میں یہ سوسائٹی قائم کی اور اپنا سب کچھ اس سوسائٹی کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند برس میں ہی سوسائٹی ایک شجر پُر از برگ و بار ہو گئی، اس کی

طرف سے ایک سماہی علمی اور تحقیقی رسالہ انگریزی اور فارسی میں ”انڈو ایرازیکا“ کے نام سے بڑی باقاعدگی اور باضابطگی سے شائع ہونے لگا۔ سوسائٹی نے جدید فارسی کی تعلیم کا بھی اہتمام کیا، فارسی زبان و ادب کے مشاہیر پر سیمینار منعقد کئے، اعلیٰ درجے کی کتابیں شائع کیں ہندوستان اور ایران کے مشاہیر علم و ادب سے ربط پیدا کیا اور خاص خاص مواقع پر ”انڈو ایرازیکا“ کے ضخیم انٹیل نمبر شائع کئے جو دونوں ملکوں کے ارباب علم میں نہایت مقبول اور پسندیدہ ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی سمجھ بوجھ اور خلوص عمل سے سوسائٹی کے حلقہ کار میں کلکتہ اور بیرون کلکتہ کے اعلیٰ طبقہ کے ایسے افراد و اشخاص کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر لیا تھا جن میں ہندو، مسلمان، عیسائی، پارسی اور سکھ ہر ملت و مذہب کے لوگ تھے، ان میں ارباب علم و ادب بھی تھے اور دو تہمتنا تاجر بھی۔ یونیورسٹی اور کالجوں کے اساتذہ بھی اور بیرسٹر اور وکیل بھی۔ اس طرح سوسائٹی کی حیثیت ایک اہم اور وسیع نیشنل ادارہ کی ہو گئی۔“ ایضاً، کلکتہ میں دس دن، مشمولہ: برہان، ندوۃ المصنفین، دہلی، جنوری ۱۹۸۰ء، جلد ۸۳، شمارہ ۱، ص ۲۹-۵۰۔

32۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی جاپان میں عالمی کانفرنس میں شرکت کے اسباب اللہ نے خود ہی فراہم کر دیئے آپ نے نہ صرف یہاں کانفرنس میں شرکت کی بلکہ آپ کو جاپان کی سیر و سیاحت کا بھی موقع ملا۔ آپ نے اپنے مقالہ ”چند روز جاپان میں“ فروری ۱۹۷۱ء، جلد ۶۶، شمارہ ۲، ص ۱۲۹، اپریل ۱۹۷۱ء، جلد ۶۶، شمارہ ۴، ص ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، جنوری ۱۹۷۲ء، جلد ۶۷، شمارہ ۱، ص ۲۳۶-۷۲ ڈالی ہے۔ چند روز جاپان میں، فروری ۱۹۷۱ء، جلد ۶۶، شمارہ ۲، ص ۱۲۹، اپریل ۱۹۷۱ء، جلد ۶۶، شمارہ ۴، ص ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، جنوری ۱۹۷۲ء، جلد ۶۷، شمارہ ۱، ص ۲۳۶-۷۲۔

33۔ ایضاً، سفر نامہ پاکستان، مشمولہ: برہان، ندوۃ المصنفین، دہلی، جنوری ۱۹۷۸ء، جلد ۸۰، شمارہ ۱، ص ۱۹-۲۰۔³⁴ ایضاً، کلکتہ میں دس دن، ص ۵۱، ۵۲۔

35۔ ایضاً، پاکستان میں بین الاقوامی سیرت کانفرنس اور میرے مشاہدات و تاثرات، مشمولہ: برہان، ندوۃ المصنفین، دہلی، ستمبر ۱۹۷۶ء، جلد ۷۷، شمارہ ۳، ص ۱۸۰۔

36۔ ایضاً، ایران میں چند روز، فروری ۱۹۷۱ء، جلد ۶۶، شمارہ ۲، ص ۱۳۰-۱۳۲۔

37۔ ایضاً، دیارِ غرب کے مشاہدات و تاثرات، فروری ۱۹۶۵ء، جلد ۵۴، شمارہ ۲، ص ۱۲۳-۱۲۴۔

38۔ ایضاً، چند روز نئی تال میں، ص ۵۱۔

39۔ ایضاً، ایران میں چند روز، جولائی ۱۹۷۰ء، جلد ۶۵، شمارہ ۱، ص ۵۵۔

40۔ ایضاً، نومبر ۱۹۷۰ء، جلد ۶۵، شمارہ ۵، ص ۳۳۵-۳۳۷۔

41۔ ایضاً، چند روز نئی تال میں، ص ۵۲-۵۳۔

42۔ ایضاً، جنگور میں ایک اہم سیمینار اور اس نواح کا میرا پہلا سفر، ص ۲۱۹-۲۲۰۔⁴³ ایضاً، چند روز جاپان میں، فروری ۱۹۷۲ء، جلد ۶۸، شمارہ ۲، ص ۱۳۳۔

44۔ ۱۹۶۲ء میں علی گڑھ یونیورسٹی سے تعلق کے دوران آپ کو مک گل یونیورسٹی مونٹریل (کینیڈا) میں انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز میں بحیثیت مہمان پروفیسر مدعو کیا گیا تھا۔ آپ کا قیام یہاں مئی ۱۹۶۳ء تک رہا۔

45۔ مزید تفصیلات کے لیے برہان کا شمارہ دیکھئے: اکبر آبادی، سعید احمد، دیارِ غرب کے مشاہدات و تاثرات، مارچ ۱۹۶۶ء، جلد ۵۶، شمارہ ۳، ص ۱۸۳-۱۸۵۔

46۔ ایضاً، ایران میں چند روز، اگست ۱۹۷۰ء، جلد ۶۵، شمارہ ۲، ص ۱۳۰-۱۳۱۔

47۔ ایضاً، نومبر ۱۹۷۰ء، جلد ۶۵، شمارہ ۵، ص ۳۳۷۔

48۔ ولفریڈ کینول اسمتھ مک گل یونیورسٹی مونٹریل (کینیڈا) میں اسلامی علوم و فنون کے ایک انسٹیٹیوٹ کے ڈائریکٹر تھے، آپ کی مشہور کتاب ”اسلام ان ماڈرن انڈیا“ ہے۔ انہیں کی پیش کش پر مولانا ایک برس کے لیے بحیثیت وزٹنگ پروفیسر، انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز مک گل یونیورسٹی گئے تھے۔

49۔ اکبر آبادی، سعید احمد، دیارِ غرب کے مشاہدات و تاثرات، فروری ۱۹۶۳ء، جلد ۵۳، شمارہ ۲، ص ۱۲۰-۱۲۱۔

50۔ ایضاً، ستمبر ۱۹۶۳ء، جلد ۵۱، شمارہ ۳، ص ۱۸۰-۱۸۱۔

51۔ ایضاً، جنگور میں ایک اہم سیمینار اور اس نواح کا میرا پہلا سفر، ص ۲۲۳-۲۲۴۔

52۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب مولانا سعید احمد اکبر آبادی سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں بحیثیت لیکچرار کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ اسی کالج میں جنرل محمد ضیاء الحق وہاں طالب علم تھے۔ سابق صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق سمیت طالب علموں اور معلموں کی ایک کثیر تعداد نے ان کی علمی شخصیت سے فیض حاصل کیا۔

آپ کا قیام سینٹ اسٹیفن کالج میں ۱۹۳۰ء یا ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۷ء تک رہا۔ آپ نے اس کالج میں چھ سال تک تدریس کے فرائض سرانجام دیئے۔

53۔ ایضاً، پاکستان، جنوری فریقہ اور پھر پاکستان، مشمولہ: برہان، ندوۃ المصنفین، دہلی، جنوری ۱۹۸۲ء، جلد ۸۸، شمارہ ۱، ص ۳۰-۳۳۔